اسلام کی قوّتِ محرّکہ

اور

مسلمانوں کا ذہنی جمود

از

جسٹس قدیر الدّین احمد

کارواں رفت، تو در خواب، بیاباں در پیش

کے رَوی؟ رہ زِ کہ پُرسی، چہ کنی۔ چوں باشی

حافظؒ

اسلام کی قوتِ محرّکہ

اور

مسلمانوں کا ذہنی جمود

مصنف

جسٹس قدیر الدین احمد

سابق چیف جسٹس مغربی پاکستان

مقدمہ

مولانا سید عبد القدوس ہاشمی ندوی

ڈائرکٹر موتمرِ عالم اسلامی

ناشر

سید الطاف علی بریلوی (علیگ)

سکریٹری

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس

بی روڈ ـــــ ناظم آباد ۱ کراچی

طبع اوّل

تعداد ـــــــــــــــــ ایک ہزار

قیمت ـــــــــــــــــ [illegible] ئے

مطبوعہ

شیخ شوکت علی پرنٹرز کراچی

فہرست مضامین

صفحہ

صفحہ

مرحلۂ سوم

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

مقدمہ

(از جناب مولانا سیّد عبدالقدوس ہاشمی ندوی)

یہ کتاب جو اس وقت زیرِ نظر ہے۔ ہمارے مکرم و محترم جناب جسٹس قدیرالدین احمد صاحب سابق چیف جسٹس مغربی پاکستان اور فی الحال صدر آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے اس توسیعی خطبہ کا انگریزی سے اُردو میں ترجمہ ہے جو موصوف نے جامعہ کراچی کے لئے لکھا تھا۔

فاضل موصوف نے اس خطبہ میں بعض انگریزی مصنفین کی اس غلط فہمی کا ازالہ کیا ہے کہ اب اسلام میں قوتِ محرکہ باقی نہیں ہے۔ اسلام کی عہد آفرینی میں جس قدر قوتِ محرکہ موجود تھی وہ اب امتداد زمانہ کے ساتھ ختم ہو چکی ہے۔ اس کی وجہ اندرونی ہے، بیرونی نہیں

ہے، یورپ کے بعض مصنفین کا خیال یہ ہے کہ اب پھر سے اسلام میں قوتِ محرکہ کا پیدا ہونا ممکن نہیں ہے۔ لیکن بعض کا خیال ہے کہ وہ قوت اب پھر نمودار ہو رہی ہے۔

اس خطبہ میں تاریخ اسلام سے اس کا ناقابلِ انکار ثبوت مہیا کیا گیا ہے کہ اسلام میں قوتِ محرکہ موجود ہے اور موجود رہی ہے۔ امتدادِ زمانہ یا کسی اندرونی وجہ سے اسلام غیر متحرک نہیں ہوا ہے بلکہ تاریخ کے ایک دور میں خود مسلمانوں نے ہی اس کی قوتِ محرکہ کو روک کر غیر متحرک بنا دیا تھا حالانکہ اس میں اب بھی ویسی ہی قوتِ محرکہ موجود ہے جیسی کہ ابتدائی صدیوں میں تھی اور یہ قوتِ محرکہ مسلمانوں کے طرزِ عمل کی تبدیلی کے بعد پھر اسی طرح حرکت میں آسکتی ہے۔

انہوں نے تاریخی ادوار کا اس بالغ نظری کے ساتھ پورا جائزہ لیا ہے جو انہیں وسیع مطالعہ سے حاصل ہوا ہے۔ اور فطرت فیاض کی طرف سے عطا کردہ ذہانت و فطانت نے ان کو عطا کیا ہے۔ جو شخص بامعان نظر اس کتاب کو پڑھے گا وہ اس کا اقرار کرے گا کہ مصنف نے اپنا دعویٰ خالص علمی انداز میں ٹھوس تاریخی شہادت سے ثابت کر کے یورپی مصنفین کی غلط فہمی کا پوری طرح ازالہ کر دیا ہے۔ انہوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اسلام کی قوتِ محرکہ کو کسی اندرونی یا بیرونی قوت نے زیر نہیں کیا ہے۔ بلکہ تاریخ کے اس طویل عرصہ میں ایسے دور آئے ہیں جب کہ خود مسلمانوں نے اپنے عقائد اور اپنے ایمان کے تحفظ کیلئے

غیر متحرک زندگی مثلاً تقلید و تصوّف کو متحرک اور نفاذ طرز زندگی پر ترجیح دے کر، اختیار کر لیا۔ اور اس طرح اسلام کی وہ قوت محرکہ جو اندھی تقلید کی رسیوں کو کاٹتی، ذہنی وسعت کے میدانوں تک پہنچاتی اور ایجادات کے دروازے کھولتی بے کار ہو گئی۔ اگرچہ یہ قوتِ محرکہ موجود تھی اور آج بھی موجود ہے۔ لیکن ۔

مجھ سے فرمائش کی گئی ہے کہ میں اس خطبہ کی اشاعت اُردو کیلئے ایک مقدمہ لکھوں میں نے بہت غور کے ساتھ اس خطبہ کو پڑھا اور پسند کیا اس لئے یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ اس پر مقدمہ لکھوں۔

وَمَا توفیقی اِلَّا باللّٰہ

تحریکِ اسلام کی نوعیت

غیر مُسلم ہی نہیں بلکہ متعدد مسلمان علمار نے بھی جن کے علم و مطالعہ سے انکار ممکن نہیں۔ تحریکِ اسلامی کی فطری نوعیت پہ غور کرنے میں غلطی کی ہے اور اس کی وجہ سے اس کی قوتِ محرکہ اور بقائے دوام کو سمجھنے میں غلط فہمی کے شکار ہو گئے ہیں۔ لیکن مسلمانوں کو چونکہ یہ یقین کامل حاصل ہے کہ اب حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی دوسرا نبی قیامت تک نہیں آئے گا۔ اس لئے آنحضرتؐ کی اُمت پہ یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ نئی نئی مشکلات اور نئے نئے حالات پر قابو پائے۔ اس پیہم کاوش کا تقاضہ ہے کہ نہ اسلام کی قوتِ محرکہ کبھی ختم ہو اور نہ اس کی نشاۃِ ثانیہ یا حیاتِ نو کا

کوئی وقت آسکتا ہے۔ اسلام کی نشاۃِ اولیٰ اور حیاتِ اولیٰ میں جس قوتِ محرکہ کا وجود ہمیں نظر آتا ہے وہ ہمیشہ سے قائم ہے اور قیامت تک قائم رہے گا۔ یہ اسلام کی فطرت کا اعجاز ہے کہ مسلمان مفکرین تحریکِ اسلامی پر غور کرنے میں غلط فہمی کا شکار ہونے کے باوجود اپنے یقین وایمان کے ماتحت یہ کہہ جاتے ہیں کہ:۔ ؎

آج بھی ہو جو براہیم کا ایمان پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستان پیدا

رہے غیر مسلم اہلِ قلم تو وہ قابلِ رحم ہیں کہ ان کے قلوب یقین سے اکثر خالی ہوتے ہیں، ان کو غلط فہمی کا شکار ہونے سے روکنے کے لئے کوئی چیز موجود نہیں ہوتی، بلکہ اس کے برخلاف ان کے ذہنوں میں تحریکِ اسلامی کے خلاف کسی نہ کسی قدر شعور میں یا لاشعور میں ایک جذبۂ حسد موجود ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ اسلامی تحریک کی نوعیتِ خاص کے سمجھنے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جو پیغام سنایا اور جو دعوت دی وہ اسی طرح کی ایک سیاسی و اصلاحی تحریک تھی جیسی کہ آپ سے پہلے بھی مختلف نسلی اور وطنی اجتماعِ انسانی میں پیدا ہوتی رہی ہے۔ نسلی عصبیت یا وطنی قومیت ایسی تحریکوں کی پشت پناہ ہوتی ہے۔ اور یہ دورِ وسعت پذیری میں آکر اتنی پھیل جاتی ہے کہ افراد میں ربط باقی نہیں رہتا۔

اس لئے یہ امتدادِ زمانہ سے ختم ہو جاتی ہے یا غیر فعال ہو جاتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ نسلی رابطہ پھیلتے پھیلتے ہمیشہ کمزور ہو جاتا ہے اور اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ وطنی رشتہ اپنے اوّلین عہد میں ایک مضبوط دفاعی قومیت پیدا کر کے اقتدار پر قبضہ کر لیتا ہے اور جب یہ دفاعی قومیت اپنے ابتدائی مقاصد میں کامیاب ہو جاتی ہے تو فوراً ہی ہجومی قومیت بن کر گرد و پیش کی قوموں کو غلام بنا لیتی ہے، اب دوسرے مرحلہ میں مفتوح اقوام میں وہی دفاعی قومیت پیدا ہوتی ہے جو پہلی وطنی قومیت میں کارفرما ہوتی ہے پھر آپس میں ٹکراؤ ہوتا ہے اور بالآخر ایک وطنیت کو دوسری جدید وطنیت کے لئے جگہ چھوڑ دینی پڑتی ہے۔ یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے اور یقیناً ماضی ہی نہیں بلکہ حال میں بھی چل رہا ہے۔ اور مستقبل کے متعلق کون کہہ سکتا ہے کہ کب تک اور کس کس رنگ میں یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔

سب سے بڑی غلطی یہی ہے کہ اسلام کو بھی اسی قسم کی کوئی تہذیبی و تمدنی تحریک سمجھ لیا جائے۔ اسلام اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا پیغام اس قسم کا ہرگز نہ تھا۔ اسلام تو دعوتِ عمل اور دعوتِ تسخیر کائنات لے کر آیا ہے۔ کسی نسلی ارتباط یا وطنی روابط پر اس کی بنیاد قائم نہیں کی گئی تھی۔ اسلام کی بنیاد توحید پر یقین اور نوع انسانی کی وحدت پر قائم ہے۔ یہ شدت کے ساتھ ان تمام رابطوں کا مخالف ہے جن کے بل بوتے پر سیاسی تحریکیں پیدا ہوتی اور بڑھ کر کامیابی یا ناکامی

تک پہنچتی ہیں۔ اسلام کسی نسل کی برتری یا وطن سے وابستگی کو مجتمع بشری کے لئے بطور کلمۂ جامعہ نہ صرف قبول نہیں کرتا بلکہ اس کا بڑی شدّت کے ساتھ مخالف ہے کہ ان میں سے کسی کو قومیت کی بنیاد بنا کر کوئی معاشرہ پیدا کیا جائے۔ اسلام کا پیغام یہ ہے کہ وطنی یا نسلی رابطہ کسی نہ کسی حد تک انتظامی وحدت تو پیدا کر دے گا۔ لیکن یہ بنی نوعِ انسان کو ہمیشہ متحارب گروہوں میں تقسیم کر کے اس عالم کو غارت کرتا رہے گا۔ ایک ایماندار کو یہ حقیقت کبھی فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ ساری کائنات کا خالق، رازق اور قیوم ایک اللہ ہی ہے۔ وحدہٗ لا شریک لہٗ۔ اور یہ ساری کائنات اپنے گوناگوں اختلافات کے باوجود اللہ جل جلالہٗ کے سامنے ایک ہی مقام عبدیت پر فائز ہے۔ اور راہِ تسخیر فطرت پر گامزن ہے۔

سورۂ مریم آیت ۹۳، میں ہے کہ " جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے ان میں سے کوئی نہیں جو اللہ کے حضور عبد ہو کر نہ حاضر ہو۔ اور کیا تم لوگ نہیں دیکھتے کہ اللہ نے زمین اور آسمانوں کی ساری چیزیں تمہارے لئے مسخر کر رکھی ہیں اور اپنی کھُلی اور چھپی نعمتیں تم پر تمام کر دی ہیں"

اسی طرح کسِی کو کسِی پر نسلی یا وطنی خصوصیت کی وجہ سے عبدیت سے زیادہ کوئی حقیت حاصل نہیں ہے۔ وطنی تعصب یا نسلی افتخار پر جس مجتمع کی بنیاد قائم ہوتی ہے اس میں حق و باطل کا معیار

آدمیت کی خیر خواہی یا رضائے خالق کا حصول نہیں ہوتا ہے بلکہ وحشی وحیوانی جذبۂ انتقام کی تسکین ہوتا ہے۔ اسی لئے بے گناہوں کا قتل عام ہوتا ہے، بھری بھرائی، اور ہنستی کھیلتی آبادی پر ایٹم بم پھینکا جاتا ہے۔ نیپام بم کی بارش ہوتی ہے حالانکہ اس قسم کی ظالمانہ حرکات کا ارتکاب کرنے والوں کو خود بھی یقین کامل ہوتا ہے کہ جن لوگوں کی ظالمانہ حرکتوں کا یہ انتقام لے رہے ہیں، ان سے ان مظلوموں کا کوئی تعلق اس کے سوا نہیں ہے کہ یہ بھی اسی رقبۂ سیاسی کے رہنے والے ہیں جس کے باشندوں نے کبھی ظلم کیا تھا۔ اس صورت حال کی اصلاح کے لئے قرآن حکیم نے بار بار ہدایات دی ہیں۔ ایک جگہ ہے۔

> اے ایمان والو! اللہ کے لئے حق پر پوری قوت کے ساتھ قائم رہو اور اعتدال کے لئے نمونہ بن جاؤ، اور تمہیں کسی قوم کے خلاف جذبۂ نفرت اس بات پر ہرگز نہ اُبھارے کہ تم عدل وانصاف سے ہٹ جاؤ۔ نہیں، ہمیشہ عدل پر قائم رہو یہی تقویٰ سے قریب تر ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تم جو کچھ کرتے ہو۔ سب سے اچھی طرح باخبر ہے۔ (سورۂ المائدہ آیت ۸)

اس سے پہلے اسی سورۃ المائدہ کی آیت ۳ میں باہمی تعاون کا یہ اصول بتایا گیا ہے۔

کسی قوم کے خلاف عداوت کہ اس نے تم کو کعبہ تک پہنچنے
سے روک دیا تھا۔ اس بات پر ہرگز نہ برانگیختہ کر دے کہ تم
ظلم کر بیٹھو، نیکی اور تقویٰ میں ایک دوسرے سے تعاون
کرو۔ اور گناہ وظلم میں تعاون نہ کرو، اللہ سے ڈرتے
رہو۔ بیشک اللہ بڑی ہی سخت سزا دینے والا ہے۔

توحید خالق، مساوات نوع انسانی، نیکی اور تقویٰ کے ساتھ ساتھ تسخیر ارض وسماء وہ بنیادی نقاط ہیں جن پر تحریکِ اسلامی کی بنیادیں قائم ہیں۔ بھلا ان لازوال بنیادوں پر جو معاشرۂ انسانی قائم ہوگا۔ اس میں قوتِ محرکہ کا فقدان کیسے ممکن ہے۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ کسی قوت خود مسلمان کفر وطغیان اور سرتابی وسرکشی سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے کسی غلط تدبیر کو اختیار کر لیں۔ اور اسلام کی قوت محرکہ وقتی طور پر غیر متحرک نظر آنے لگے جیسا کہ تقلید شخصی اور تصوف کو اختیار کرنے سے ہوا۔ اس سلسلہ میں اس خطبہ کے مصنف کی رائے بڑی وقیع ہے جس کی تائید تاریخ اسلام کرتی ہے۔

اسلام اور تحریک اسلام کوئی جدید تحریک نہیں ہے، یہ ان ہی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی دعوت ہے جو حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت خاتم النبیین تک تمام انبیائے کرام دیتے رہے ہیں۔ قرآن مجید نے اس کو بار بار واضح طور پر بیان کیا ہے کہ ہمیشہ ہی سے اللہ تعالیٰ کی ہدایات اور اوامر و نواہی یہی رہے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے

کہیں حضرت نوح علیہ السلام کے حوالہ سے، کہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کا ذکر کر کے اور کہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول بیان کر کے قرآن مجید نے یہ بتایا ہے کہ دین یہی ہے جو حضرت نوح پیش کرتے تھے۔ اور سارے انبیاء علیہ السلام اسی کی دعوت دیتے رہے ہیں۔ اس لئے ان لوگوں کا یہ خیال کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔ کہ اسلام تاریخ کی دیگر اصلاحی وسیاسی تحریکوں کی طرح کی کوئی تحریک ہے۔ اس کے لئے ایک صاحب فکر کو اسلام کی خاص اور بے نظیر نوعیت کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ ورنہ جو کچھ کہا جائیگا۔ تاریخ اور واقعاتِ عالم ہمیشہ اِسے غلط ثابت کر دیں گے۔

تحریکیں جب کبھی اور جہاں کہیں شروع ہوتی ہیں اس کے مخاطب ایک مخصوص گروہ کے لوگ ہوتے ہیں۔ ان کا ایک معاشرہ ہوتا ہے۔ ایک محدود رقبۂ ارضی میں آباد ہوتے ہیں۔ ان میں اکثر تحریکیں تو انسانی زندگی کے ایک یا دو رُخ کو بدلنے کی سعی کرتی ہیں، کسی کا ہدف اخلاقی زندگی ہوتی ہے، کسی کا سیاسی زندگی اور کسی کا معاشی یا کوئی دُوسرا رُخ ہدف ہوتا ہے۔ ایسا بہت ہی کم ہوتا ہے کہ کوئی نئی تحریک ایسی پیدا ہو جو انسانی زندگی کے ہر رُخ کو بدل دینے میں کامیاب ہو جائے۔ ایسی کوئی تحریک انسانی تاریخ کے معلومہ زمانہ میں کہیں نہیں ملتی۔ اور اگر کہیں قصوں، افسانوں اور آثارِ قدیمہ میں اس کی کوئی جھلک دکھائی بھی دیتی ہے تو اس کی کامیابی کا کوئی

ثبوت مہیا نہیں ہوتا۔

بے نظیر کامیابی

کسی تحریک کے ایک مخصوص حلقہ میں کامیابی کے لئے بھی ہمیشہ اسباب اور وجوہ کا ایک وسیع سلسلہ ہوتا ہے جو اس تحریک کو ایک حد تک کامیاب بناتا ہے یہ کبھی نہیں ہوتا کہ اسباب و وجوہ بالکلیہ مخالف ہوں اور کامیابی ایسی حاصل ہو جائے جو محیر العقول اور بے نظیر ہو۔ یہ دنیا عالم اسباب ہے اور اس میں اسباب و علل کا ایک لامتناہی سلسلہ ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ ان سے آزاد ہو کر یا ان اسباب کے خلاف راستہ اختیار کر کے کامیابی تک پہنچنا صرف مشکل ہی نہیں بلکہ محال کی حد تک مشکل ہے۔ لیکن یہ تاریخی واقعہ اور حقیقت ہے کہ جب قرآن مجید کی پہلی آیت سنہ ۶۱۰ء کے رمضان مبارک میں نازل ہوئی اور اس کے تقریباً دو سال کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی اور عبد کامل محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو قدیم دین اسلام کی دعوت دیں تو یہ مشکل بلکہ محال بات رسولِ خدا کی خارا شگاف صداقت، حیران کُن ہمت و جرأت اور تدابیر عالیہ کی بنا پر اللہ تعالیٰ کی مدد سے واقعہ بن گئی کہ لوگ آہستہ آہستہ مگر متواتر اپنی گمراہیوں سے تائب ہو کر دینِ اسلام میں داخل ہوتے رہے حالانکہ بظاہر اس کامیابی کے تمام اسباب مفقود نظر آتے ہیں۔

یہ کہہ دینا تو آسان ہے کہ اسلام بزورِ شمشیر پھیلا۔ لیکن بقول

عیسائی مستشرق یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ اس شمشیر کے قبضہ پر ہاتھ رکھنے والوں کو کس چیز نے متاثر کیا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نہ کوئی شہزادہ تھے اور نہ کوئی شاہی روایات ان کے آبا و اجداد سے وابستہ تھیں، نہ آپ کو بنی بنائی فوج ملی تھی، نہ مال و دولت، نہ تو آپ کوئی بہت بڑے تعلیم یافتہ فلسفی تھے اور نہ کوئی بہت بڑے زمیندار یا تاجر تھے۔ کسی کا کوئی مفاد آپ سے وابستہ نہ تھا۔ نہ آپ کو بنی بنائی قوم ملی تھی اور نہ خاندانی راج گدی، سوال یہ ہے کہ ایک ایسے شخص کے ساتھ لوگوں کی مخلصانہ وابستگی کی توجیح کیا کی جائے۔ حضرت ابو بکرؓ۔ حضرت عثمانؓ۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور ان جیسے ایک ہزار سے زائد سَابِقُوْنَ اَوَّلُوْن۔ کو کس بات نے گرویدہ کر لیا۔ علاوہ بریں حالات اور ماحول اتنا حوصلہ شکن کہ قریب ترین عزیز و اقربا، شدید دشمن، قریش کی ہیئت حاکمہ دشمن۔ راستے میں کانٹے بچھائے گئے، گلے میں پھانسی ڈالی گئی، قتل کی سازش ہوئی۔ حتیٰ کہ تیرہ سال یہ سارے دکھ سہنے کے بعد مجبوراً آپ کو اور آپ کے صحابہ و صحابیات کو مدینہ کو ہجرت کرنی پڑی۔ اس سے پہلے بھی دو بار صحابہ کو حبشہ میں جلاوطن ہو کر انتہائی افلاس کی زندگی اختیار کرنی پڑی تھی۔ یہ جلاوطنی اور یہ ہجرت دراصل بساط جنگ پر مقابلہ کی تدبیریں تھیں۔

مدینہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھی فاتح

ہو کر داخل نہیں ہوئے تھے بلکہ جان بچانے کو پناہ گیر بن کر آئے تھے لیکن آنحضرتؐ کے تدبیر کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب صرف دس سال کے بعد حضورؐ نے وفات پائی تو آپ نو لاکھ ستائیس ہزار مربع میل کے فرماں روائے مطلق تھے۔ اور وحشی درندوں کے سے بد کردار انسانوں کی آبادی میں ایسا امن تھا کہ دنیا کی آنکھیں ایسے امن کی تلاش میں آج تک نگراں ہیں۔ آپ نے آخری دس سال مسائل کے حل کرنے میں جس قدر مصروف گذارے اسے کون نہیں جانتا۔ کہاں اور کب چشم فلک نے یہ منظر دیکھا ہے کہ چند سو فاقہ کش اور مفلس و قلاش پناہ گزین نسبتاً خوش حال اور آباد انسانوں میں آکر مقیم ہوں، اور صرف آٹھ سال کے اندر ایک ایسی وحدانی حکومت قائم کرلیں جو نو لاکھ ستائیس ہزار مربع میل کے وسیع رقبہ اور لاکھوں انسانوں پر حاوی ہو۔ اور اس وسیع علاقہ میں سے بذریعہ فوج مفتوحہ رقبہ چار ہزار مربع میل بھی نہ ہو، باقی سارا رقبہ بے جنگ و جدال آگیا ہو۔

ایک اور عجیب سی بات یہ بھی نظر آتی ہے کہ تاریخ معلومہ میں کسی ملک اور کسی زمانہ میں کوئی آدمی ایسا نہیں ملتا جس نے خود کوئی تحریک چلائی ہو اور اپنی زندگی ہی میں اپنے آپ کو پوری طرح کامران و کامیاب بھی دیکھ لیا ہو۔ کسی فکر کے پھیلنے میں اور کسی تحریک کے کامیاب ہونے میں اتنا وقت لگتا ہے کہ انسان کی مختصر زندگی اس کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ بانی ختم ہو جاتا ہے، اس کے بہت دنوں

کے بعد تحریک کامیابی کے حدود میں داخل ہوتی ہے۔ ہمہ جہتی تبدیلی واصلاح تو بڑی بات ہے۔ کسی ایک رُخ کو ہدف بنانے والی سیاسی معاشی اور اخلاقی تحریکوں کو دیکھئے، کبھی کوئی تحریک اپنے بانی کی زندگی میں کامیابی تک نہیں پہنچتی ہے۔ لیکن یہ تدبیر صرف رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ میں نظر آتی ہے کہ صرف ۶۳ سال کی حیاتِ طیبہ میں اور صرف ۲۲ سال کے عرصہ میں۔

رہا ڈر نہ بیڑے کو موج بلا کا
اِدھر سے اُدھر پھر گیا رُخ ہوا کا

ہم اس کی اور کیا توجیہہ کر سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ یہی چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ خاص کے اثر اور ان کی کارگر تدبیر کے ذریعہ عالم اسباب کو مسخر کر دیا۔ ذات، صفات اور تدابیر نے دنیا بدل دی

چشم افلاک یہ نظارہ ابد تک دیکھے
رفعت شان رفعنا لک ذکرک دیکھے

قوتِ محرکہ اسلام نے اپنے پیروؤں کو اللہ تعالیٰ کا یہ حکم سنایا تھا کہ زمین پر جو کچھ پیدا کیا گیا ہے وہ سب کچھ انسانوں ہی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔

سورۂ البقرہ آیت ۲۹ میں ارشاد ہے۔

" اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے تمہارے لئے وہ سب کچھ پیدا

کیا جو زمین میں ہے۔"

اس حکم الٰہی نے مسلمانوں میں جذبۂ محرکہ پیدا کیا کہ وہ تلوار، قلم، علم، تجربہ اور فکر سب کے دھنی ہو گئے۔ وہ قوتِ محرکہ پیدا کی جس نے الگ الگ تین رخ پر حرکت پیدا کر دیں۔

(۱) فتوحات (۲) تبلیغ (۳) تمدن آفرینی

مسلمانوں کی یہ تینوں حرکات ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ نہیں ہوتی تھیں۔ جن تاریخ خوانوں کو اس میں شبہ ہو وہ غور کے ساتھ پچھلے چودہ سو سال کی تاریخ عالم کا مطالعہ کریں۔ انہیں یہ نظر آجائیگا کہ مسلمانوں نے کبھی انڈونیشیا، سراواک اور ملیشیا پر فوج کشی نہیں کی لیکن آج ان ممالک میں مسلمانوں کی اکثریت ہے مسلمانوں نے قبرص اور ہندوستان پر سینکڑوں سال تک حکومت کی اور وہاں مسلمان اقلیت میں ہیں۔ مسلمانوں نے چین پر حکومت کبھی نہیں کی مگر وہاں ساڑھے سات کروڑ سے زیادہ مسلمان موجود ہیں۔ اندلس پر سینکڑوں سال تک حکومت کی مگر اب وہاں مسلمان نہیں ہیں۔

اسی طرح ایران ۱۷ھ میں فتح ہو گیا مگر ۲۰۲ھ میں وہاں مسلمانوں کی اکثریت ہوئی۔ مصر ۲۳ھ میں فتح ہوا مگر مصریوں کی اکثریت کے مسلمان ہونے میں مزید ایک سو سال سے زیادہ عرصہ لگ گیا۔

یہ تو محض دو چار مثالیں ہیں۔ تاریخ عالم کے عمیق مطالعہ سے

ایسی سینکڑوں مل جائیں گی جن سے ایک محقق اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ تبلیغ یا تمدنی رو ہمیشہ فتوحات اور فوجی مہمات سے وابستہ نہیں رہی ہے۔ تہذیب اور تمدن آفرینی سے ہماری مراد یہ ہے کہ لوگوں کے انفرادی اعمال کا معیار اجتماعی طور طریق زندگی اور علوم نظری و تطبیقی میں جو کارنامے مسلمانوں نے انجام دیئے وہ فتوحات کے لازمی نتائج نہ تھے بلکہ وہ ایک الگ حرکت تھی جو قرآن حکیم کی اس تعلیم سے پیدا ہوئی تھی کہ زمین پر اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ جتنی نعمتیں ہیں وہ سب انسانوں ہی کے لئے ہیں۔ اور آدمی کا یہ حق ہی نہیں بلکہ بڑی حد تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے خلیفہ ارضی پر یہ فریضہ ہے کہ وہ ان تمام نعمتوں سے استفادہ کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرے۔ کوشش پیہم کی ہدایت اور اس کے ماتحت تدابیر جدیدہ مسلمانوں کی ابتدائی تاریخ کا وہ راز ہے جسے کافر جادوگری کہتے تھے۔ تاریخ کے اس دور میں جب مسلمان تسخیر عالم کے لئے سعی کرتے تھے اور خانقاہوں میں بیٹھ کر صرف نماز روزہ رکھ کر مطمئن نہیں ہو جاتے تھے۔ اس وقت انہیں بھی اپنی علمی مساعی اور تجرباتی تحقیقات میں اسی طرح کامیابیاں حاصل ہوتی تھیں جس طرح آج یورپ کو ہو رہی ہیں۔ فرغانی نے عہد المامون میں مصر میں بیٹھ کر دنیا کا پہلا ٹیلسکوپ بنا لیا تھا۔ اور حسن بن صاعد نے ۴۵۵ھ کے قریب دنیا کا پہلا قلم مداد (فاونٹن پن) بنا کر پیش کر دیا تھا۔ ابن یونس مصری نے ۴۰۰ھ سے قبل

ہی گھڑیوں کے لئے رقاص بنالیا تھا اور ادریسی نے ۵۴۰ھ سے پہلے دنیا کے بہت بڑے حصہ کا سفر کر کے جغرافی اطلس بنالیا تھا۔ اور اپنی معرکۃ الآراء کتاب نزہتہ المشتاق بھی تصنیف کر لی تھی۔ اس سعی و محنت کے ساتھ تحقیقی تجربات کرنے والوں نے طبیعات، کیمیا، حیاتیات، حیوانیات اور نباتیات کے علوم میں بڑی گرانقدر کامیابیاں حاصل کر لی تھیں۔ یہ کامیابیاں ہمیشہ فتوحات اسلامی سے وابستہ نہیں ہوتی تھیں۔ اور ان میں سے بہت سی تحقیقات و تصنیفات تو وہاں بیٹھ کر ہوئی ہیں جہاں مسلمانوں کی حکومت بھی نہ تھی۔ مثلاً ادریسی کے کارنامے ایک عیسائی بادشاہ کے شہر میں انجام پائے تھے۔

قوت محرکہ کا رُخ

۱۳۲ھ تک جبکہ خلافت اسلامی کا اقتدار آخری مروانی خلیفہ کے ہاتھ سے نکل کر عباسیوں کے ہاتھوں میں آیا تو فاتحانہ عزائم کا رُخ سیاسی مصالح کے ماتحت عباسیوں نے عیش کوشی اور بے سُود دماغی کاوشوں کی طرف موڑ دیا۔ مسند خلافت کو جو آخری مروانی خلفاء کے دور تک مسلمانوں کا صرف سیاسی و سماجی مرکز تھا تقدس اور احترام کا مرکز بنا کر اپنے نقص صلاحیت پر پردہ تو ڈال دیا مگر اس کے لازمی نتیجہ سے وہ نہ خود محفوظ رہ سکتے تھے اور نہ اُمتِ مسلمہ کو محفوظ رکھ سکے۔ تاریخ اسلام کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ عباسیوں کے طویل عہد ۶۵۶ھ تک فتوحات اسلامی کا سلسلہ تقریباً منقطع ہو گیا۔ مرکز

گمریز طاقتوں نے اُمتِ اسلامیہ کا تیا پانچہ کر کے رکھ دیا۔

فلسفۂ قدیم یہ عباسی دور ہی کی بات ہے کہ یونانی فلسفہ کی مرممہ تعلیمات اسکندریہ اور دمشق کے ذریعہ مسلمانوں میں پھیلنے لگیں۔ یہ مراکز فلسفہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں فتح ہو چکے تھے۔ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ ہی سے ان مراکز کے طبی و طبیعاتی تجربات کا علم مسلمان حاصل کرنے لگے تھے۔ لیکن فلسفیانہ نظریات کی ابھی عام اشاعت نہیں ہوئی تھی۔ مروانی خلفاء کی تعلیمی پالیسی یہ تھی کہ دوسری قوموں سے تجرباتی علوم تو حاصل کئے جائیں مگر ان کے نظریاتی علوم کو رد کر دیا جائے یا کم از کم یہ کیا جائے کہ ان کو کوئی اہمیت نہ دی جائے اس لئے بہت ہی کم لوگ نیو فلاطونی یا فائلو کے فلسفیانہ افکار سے متاثر نظر آتے ہیں۔ لیکن جب عباسی خلفاء کے ابتدائی دور ہی میں صحابہ کے شاگردوں اور تابعین کا زمانہ ختم ہو گیا تو یہ بند ٹوٹ گیا اور خود عباسی خلفاء نے ان درآمد شدہ فلسفیانہ افکار کی سرپرستی شروع کر دی پھر یہ افکار نوجوانوں میں خوب پھیلے اور نتیجہ یہ نکلا کہ۔

افکار کے نغمہ ہائے بے صوت
ہیں ذوقِ عمل کے واسطے موت

اس وقت اسلامی عقائد و افکار پہ دو مکتب ہائے فلسفہ نے حملہ کیا۔

(۱) فلسفۂ مشائین، چونکہ حسب روایات قدیمہ اس فلسفہ کی تعلیم ارسطو حکیم نے کبھی اپنے باغ میں حالت مشی یعنی ٹہل ٹہل کر دی تھی۔ اس کو فلسفۂ مشائین کہا جاتا ہے اس کا اندازِ فکر یہ ہے کہ احساسات ظاہری سے جو معلومات ہمیں حاصل ہوتی ہیں ان کو منطقی اشکال پر مرتب کر کے مجہولات کا علم حاصل کیا جائے۔ صغریٰ موجبہ اور کبریٰ کلی کے ذریعہ نتیجہ برآمد کیا جائے۔

(۲) فلسفۂ اشراقین، یعنی وہ فلسفہ جس کے لئے ابتدائی معلومات بذریعہ اشراق حواس باطنی کے واسطہ سے حاصل ہوں۔ اس کی بنیاد مراقبہ، گیان دھیان اور وجدان پر ہے۔

علم کلام اور تصوّف

جب ان دونوں مکتبہ ہائے فکر سے اسلامی افکار و عقائد پر حملے شروع کئے گئے تو مسلمان علماء بھی ان حملوں کا مقابلہ کرنے کے لئے اکھاڑے میں اُترے۔ اس وقت مسلمان علماء کے تین گروہ ہو گئے۔

(الف) وہ علمائے ربانیین جو اپنے روایاتی علوم سے وابستہ تھے، ان میں زیادہ تر محدّثین، فقہاء اور مورخین تھے۔ انہوں نے ان حملہ آوروں کے خلاف نفرت کا اظہار کیا اور ان کو جاہل اور نااہل قرار دے کر ناقابل اعتناء سمجھا۔

(ب) متکلمین، وہ علماء جنہوں نے فلسفہ مشائین کا عمیق مطالعہ کیا

اور ان ہی کے ہتھیاروں سے اسلامی افکار سے دفاع کا کام لیا۔ ان کی مساعی سے ایک جدید علم پیدا ہوا جسے علم کلام کہا جاتا ہے اور اسی نسبت سے یہ لوگ علمائے متکلمین کہلاتے ہیں۔

(ج) کچھ لوگوں نے جو مخلص مسلمان تو تھے لیکن ہمارے روایتی علوم تفسیر، حدیث اور فقہ میں کوئی صاحب کمال نہ تھے۔ اشراقیوں کے فلسفہ کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اور خود بھی اشراقی تجربات کئے، مراقبہ، مکاشفہ، چلہ کشی وغیرہ میں اپنے قیمتی اوقات صرف کئے اور اشراقیوں کے مقابلے کے لئے میدان میں آگئے۔ بڑی نیک نیتی سے دینِ اسلام کی مدد ہی کے لئے آئے مگر بے علم ہونے کی وجہ سے اکثر مقابلوں میں غلط راہ پر جا نکلے۔ ان کی مساعی جمیلہ سے ایک فن وجود میں آیا جس کا نام تصوف پڑ گیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ کوفہ میں کوئی وارفتہ آدمی تھا، ابوہاشم الکوفی المتوفی ۱۵۰ھ جو اونی کرتا پہنتا تھا۔ اس لئے صوفی کہلاتا تھا۔ پھر اس کے بعد جن لوگوں نے اس قسم کا لباس اختیار کیا اُنہیں متصوف یعنی بہ تکلف صوفی بننے والا کہا جانے لگا۔ اور اس کا مصدر ہوا التصوف۔ حضرت علی بن عثمان ہجویریؒ اپنی کتاب کشف المحجوب میں کہتے ہیں کہ پہلے تصوّف کا نام نہ تھا مگر کام تھا اور اب نام ہے کام نہیں۔

مفسرین، محدثین اور فقہاء کی کتابوں میں تو متکلمین اور صوفیاء کا ذکر ہی بہت کم آتا ہے۔ شاید یہ لوگ ان دونوں کو درخورِ اعتنا ہی

نہیں سمجھتے۔ لیکن ابتدائی دور کے متکلمین اور صوفیاء کی کتابیں جو مل جاتی ہیں ان کے مطالعہ میں یہ نظر آتا ہے کہ ان بزرگوں کا یقین وایمان مشائین یا اشراقیین کے فلسفہ پر نہیں ہے بلکہ وہ ان دونوں قسم کے علم الاوائل کو محض دفاعی ضرورت کے لئے استعمال فرماتے ہیں۔ اسی طرح جب ہم فقہ اسلامی کی ابتدائی کتابوں کو دیکھتے ہیں تو ان میں کسی فقیہہ اعظم کے قول کو بھی واجب التسلیم قرار دینے کی صورت نہیں ملتی۔ امام محمد شیبانی رح اپنے جلیل القدر اساتذہ حضرت امام ابوحنیفہ رح، حضرت امام مالک رح اور حضرت امام یوسف رح سے بیسیوں جگہ اختلافات کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہی حال دوسرے آئمہ فقہ کا ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ۴۰۰ھ تک بلکہ اس کے بعد بھی فقہ میں تقلید کا ثبوت نہیں ملتا۔

حملۂ تاتار عباسیوں کے آخری زمانہ میں تاتاری کفار نے شدید ظالمانہ حرکات اور قتل و خون کے ذریعہ سارے اسلامی ممالک کو ویران کیا۔ دہشت گردی کا یہ دور بڑی طویل مدت یعنی ۶۵۸ھ تک قائم رہا اور تاتاری وحشیوں کا زور اس وقت ٹوٹا جبکہ تقریباً ۲۵ رمضان المبارک ۶۵۸ھ کو معرکۂ عین جالوت میں ان کو شکست ہوئی اور ان کی وہ سورما فوج جسے پچھلے ساٹھ سال میں کہیں شکست کا منہ نہیں دیکھنا پڑا تھا، بالکلیہ تباہ و برباد ہوگئی۔ اور اس کے بعد جلد ہی تبلیغ اسلام کا کام کیا اور اللہ تعالیٰ

نے ہلاکو خاں کے پوتے احمد خدا بندہ کو ہدایت عطا فرما کر دین اسلام کا حامی بنا دیا۔

تا تاری وحشت گردی بلکہ اس کے بعد بھی بیس پچیس سال کے طویل زمانہ میں اسلامی قوتِ محرکہ کو مسلمانوں نے خود ہی عمل سے باز رکھنے کی سعی کی، وجہ بالکل ظاہر ہے کہ اس طویل مدت میں جبکہ مسلمانوں کی تین نسلیں جوان ہو کر میدانِ حیات میں آئیں یہ سوال سب سے زیادہ اہم رہا کہ مسلمانوں کو ان کے قدیم عقائد و اعمال سے وابستہ کیسے رکھا جائے۔ متکلمین کی بحثیں اس کے لئے بالکل غیر مفید نظر آئیں۔ کسی کو یہ سمجھانا آسان نہ تھا کہ صفاتِ الٰہی سے ذاتِ الٰہی کا کیا رابطہ ہے، یا جزء لایتجزیٰ کا وجود باطل نہ ہوا تو اسلامی عقائد پر اس کا برا اثر پڑے گا۔ یہ اور اس قسم کی بحثیں سننے کو اب کون تیار ہوتا اور جبراً قہراً اسے مکتبوں اور مدرسوں میں پڑھ بھی لیتا تو دلی اطمینان کہاں سے لاتا۔ اس لئے مسلمان علماء نے جدید ذہنوں پر حملوں کے خلاف ایک تدبیر کی اور وہ یہ کہ اسلام میں جو قوت محرکہ تھی اسے روک کر اصلاحِ ذات اور انفرادی تزکیۂ نفس کو اہم ترین فریضہ قرار دیا۔ نیت اُن کی بُری نہ تھی لیکن کیا کرتے۔ حالات ایسے نازک تھے کہ۔

ے حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک
چراغ کشتۂ محفل سے اُٹھے گا دھواں کب تک

اس طرح اُنہوں نے الحاد و بے دینی کے خلاف اچھی کامیابی حاصل

کی، تزکیۂ نفس اور ترکِ دنیا کی ایک دیوار بنا کر کھڑی کر دی، لیکن اس کا ہولناک نتیجہ یہ ہوا کہ علم کے میدان میں بھی قوتِ محرکہ کمزور پڑ گئی۔ رہا جہاد کا میدان تو اس میدان میں۔

ع کند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغ بے نیام

اسی زمانہ میں فقہاء نے یہ عجیب و غریب نظریہ وضع کیا کہ حاکمانِ عدالت کو بھی تطبیق احکام میں اجتہاد کی صرف اس حصار کے اندر ہی اجازت ہے جو کسی ایک فقہی مسلک نے قائم کر رکھی ہے۔ اسے اجتہاد فی المذہب کا نام دیا گیا۔ رہا اجتہاد مطلق تو اس کا دروازہ بند ہے۔ فائدہ اس سے کچھ نہ ہوا، یقیناً اس طرح ذہنی و عملی انتشار کے خلاف ایک رکاوٹ پیدا ہو گئی۔ لیکن اس سے نقصان بھی بہت ہوا۔ اور زمانہ مابعد میں تطبیق کا عمل انتہائی حد تک مشکل ہو گیا۔ عملی طور پر عدالتوں میں اس کی خلاف ورزیاں ہوئیں اور مجبوراً ہوئیں۔ کہا تو یہ جاتا ہے کہ "بنتے بہت دیر لگتی ہے اور بگڑتے کچھ دیر نہیں لگتی"۔ لیکن مسلمانوں کی تاریخ میں یہ قول الٹا ہو گیا۔ یہاں بنتے کم دیر لگی، اتنی کم کہ وفات رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد صرف ۸۵ سال کے اندر خلافت اسلامی کے حدود پاکستان کے شہر ساہیوال سے فرانس کے اندر تک پھیل گئے۔ مسلمان تاجروں نے چین کے شہر کنٹون سے لے کر کوہ طارس تک نومسلموں کی آبادیاں قائم کر دیں۔ لیکن بگڑتے بگڑتے بارہ صدیاں گذر گئیں۔

اسلام کی قوتِ محرکہ اب بھی باقی ہے، اور قیامت تک باقی رہے گی، کیونکہ اس کی بنیاد عقیدۂ توحید پہ ہے جو قوانین فطرت کی تحقیق اور تسخیر عالم کی دعوت دیتا ہے۔ نیز یہ دین نوع انسانی کا اولین اور آخری دین ہے۔ دعا ہے کہ پندرہویں صدی کے آغاز پر مسلمان اس نکتہ کو سمجھ لیں کہ۔

ع تمغۂ ایمان نہیں ملتا نمائش کے لئے

اللہ کرے کہ مسلمان میدانِ جہاد اور میدانِ علم دونوں میدانوں میں اپنا فریضہ ادا کرنے پر پورے عزم اور مسلسل جدوجہد کے ساتھ کام کریں۔

اَللّٰھُمَّ استعمنا لمرضاتک یارب العٰلمین

عبدالقدوس ہاشمی

تمہید

زیرِ نظر سوال یہ ہے کہ اسلامی ثقافت میں تخلیقی صلاحیت کار ہونے کے باوجود مسلمانوں میں ذہنی جمود کیوں ہو گیا؟

چنانچہ ان اوراق میں مسلمانوں کے حکمران خاندانوں اور مسلمانوں کی سلطنتوں کے زوال یا اس کے اسباب سے بحث نہیں کی گئی ہے۔ بلکہ ان میں یہ نظریہ پیش کیا گیا ہے کہ اسلامی ثقافت کی قوت وطاقت میں اس وقت بھی کوئی کمی نہیں آئی تھی جب مسلمانوں کا ذہن جامد رہا تھا کہ اٹھارویں اور انیسویں صدیوں میں بھی جب مسلمان انتہا درجہ کی سیاسی کمزوری اور ہر طرح کی محرومی کا شکار تھے اس زمانہ میں بھی اسلامی ثقافت کی طاقت کم نہیں ہوئی تھی۔ گذشتہ دو سو سال میں تو مسلمان بہت ہی زیادہ پستی میں چلے گئے تھے، اس پستی کا فوری سبب دریافت کرنا چاہیں تو ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس کی وجہ وہ زبردست فرق ہے جو ان کے اور مغربی اقوام کے درمیان صنعت وحرفت اور سائنسی ایجادات کی صلاحیت کی بناء پر پیدا ہوتا رہا ہے۔ یہ فرق ان اقوام کی اس صلاحیت سے

خاص طور پر واضح ہوتا ہے جو طبعیاتی علوم کو فروغ دینے، جدید اسلحہ کا ذخیرہ پیدا کرنے اعلیٰ نظم وضبط قائم کرنے اور جدید تنظیم کی راہ ہموار کرنے سے نمودار ہوتی ہے، نیز یہ فرق اس طاقت سے بھی ظاہر ہوتا ہے جس کو یہ اوصاف پیدا کرتے ہیں۔ ان اوراق میں کہنا یہ ہے کہ مسلمانوں کی کوئی پستی کسی ثقافتی کمزوری کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ اس پالیسی کا نتیجہ تھی جو مسلمانوں نے اپنے تحفظ کے لئے عمدًا اختیار کی۔ اس صورتِ حال کے باعث ان کی عملی زندگی اور ان کی روح ثقافت میں ایک تضاد رونما ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی ثقافت میں تخلیقی صلاحیت کار ہونے کے باوجود مسلمانوں میں ذہنی جمود آ گیا۔

نظریہ کا خلاصہ اس نظریہ کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام کی قوتِ محرکہ یا بہ الفاظ دیگر اس توانائی میں جو اسلام پیدا کرتا ہے نہ تو کبھی ضعف آیا اور نہ اس کو کوئی چیز فنا کر سکی۔ لیکن مسلمانوں نے اپنے آپ کو ان ذہنی شکوک اور شبہات سے محفوظ رکھنا چاہا جن کا طوفان نویں صدی میں فلسفۂ یونان کے مطالعہ کے بعد دنیائے اسلام میں اٹھا تھا پھر ان تباہ کاریوں کے بعد جو تیرھویں صدی میں تاتاریوں کے حملوں کے بعد ہوئیں اور جب ان کے پاس اپنے دین کے سوا کچھ باقی نہ بچا تھا اس وقت انہوں نے اسلام کی قوتِ محرکہ کو عمدًا سختی سے دبا دیا اور بلحاظ دُور بینی اسے اختراع اور اجتہاد کے لئے استعمال کرنے سے پرہیز کیا۔

مسلمانوں کے اس جذبے سے، کہ وہ رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ کی ہو بہو پیروی کریں اور قرآن مجید کے احکام پر سختی سے کاربند ہوں، جو اثرات پیدا ہو سکتے ہیں ہمارے اس دعوے کی نفی نہیں ہوتی کہ اسلام میں قوتِ محرکہ بدرجۂ اتم موجود ہے۔ کیونکہ مسلمانوں نے جب تک ذہنی جمود کو اختیار نہیں کیا تھا۔ اسلام اپنے آغاز سے تقریباً چھ سو سال بعد تک ہر سمت میں زبردست قوتِ محرکہ کا مظاہرہ کرتا رہا۔ رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے نمونے اور قرآن کریم کے احکام نے اس دور میں توسیع و ترقی کے زبردست اثرات مرتب کیئے جو مسلمانوں کی قوتِ محرکہ کے ضامن بنے رہے۔

گیارہویں صدی میں یا اس کے قریب ذہنی قوتِ محرکہ کو دبانے کی نئی پالیسی اختیار کی گئی اور اس پر مُہر تصدیق تیرھویں صدی کے نصف آخر میں ثبت ہوئی۔ اس کے بعد سے قوتِ محرکہ گو مفقود تو نہیں ہوئی مگر چند سمتوں میں محدود ہو گئی۔ مثلاً طاقتور سلطنتوں کی تشکیل ہوئی، فنونِ لطیفہ کی ترقی ہوئی۔ ادب کی تخلیق ہوئی۔ خوش نما عمارات کی تعمیر ہوئی اور دنیا میں دینِ اسلام کی اشاعت جاری رہی۔ اس طرح مسلمانوں کی تخلیقی سرگرمیاں جاری رہیں مگر ان سرگرمیوں میں سخت حد بندی تھی۔ جس نے نہ صرف ذہن کی تخلیقی قوت اور دقیقہ رس صلاحیت کا دائرہ تنگ کر دیا بلکہ اسے مقید کر کے رکھ دیا۔ اس پالیسی سے مسلمانوں کو پانچ سو سال تک کوئی دنیوی نقصان نہیں پہنچا بلکہ اس زمانے میں

ان کی سلطنتیں دنیا کی فوق الورا طاقتیں تھیں۔ علاوہ ازیں حد بندی نے نقصان پہنچانے کے برعکس اس زمانہ کے مسلمانوں کو اپنے دین کا تحفظ کرنے میں بڑی مدد دی اور اعتقادی انتشار سے ان کو بچا کر ان کے دینی عمل کو اس کی اصلی شکل میں جاری رہنے کا سامان پیدا کیا۔ اس عظیم فائدے کی بنار پر نیز اس وجہ سے کہ اس پالیسی سے مسلمانوں کو کوئی دنیوی نقصان نہیں پہنچا مسلمانوں کو یقین ہوتا گیا کہ ان کی اختراعات ترک کرنے کی پالیسی حقیقت میں صحیح تھی۔ وہ مندرجہ بالا شعبوں میں لگاتار شاندار کامیابیاں حاصل کرتے رہے اور سترھویں صدی کے اختتام تک کوئی ایسا سبب پیدا نہیں ہوا کہ وہ اس پالیسی پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت محسوس کرتے۔ اس صدی کے اواخر میں چند اہم وجوہ کی بنار پر جس کا ذکر آگے آئے گا۔ اس پالیسی کو تبدیل کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی لیکن اس اثنار میں ان کا اندازِ فکر ایجاد اور اختراع کے متعلق ایسی روش کا عادی ہو چکا تھا کہ مسلمانوں نے روحانی ذرائع سے مزید تقویت حاصل کرنے کی جانب توجہ تو کی مگر دنیوی تقاضوں کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ بعض مجتہدین نے اٹھارویں صدی کے دوسرے نصف میں اس پہلو کی جانب توجہ دلائی تو ان کی سختی سے مخالفت کی گئی۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں اس منفی رویّے کے بارے میں بے اطمینانی کا اظہار عام طور سے کیا جانے لگا تھا لیکن ذہنی جمود کا احساس پوری طرح بیسویں صدی کے وسط میں ہوا۔ اس کے

ساتھ ساتھ اس بے چینی نے بھی جنم لیا کہ اس کوتاہی کی فوری تلافی کی جائے اس بے چینی نے بڑھتے بڑھتے جو گرما گرمی پیدا کی ہے اسے اہل مغرب اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی علامت سمجھتے ہیں۔ فی الحقیقت یہ گرما گرمی مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ نہیں بلکہ ان کی گھٹی ہوئی توانائی کا کچھ کچھ آزاد ہونا ہے۔

اوپر جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کو ثابت کرنے کے لئے ایسا تاریخی مواد پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی جو مصنف کو میسّر ہے اور جو اس کی نظر میں قابلِ اعتماد تاریخی اہمیت بھی رکھتا ہے۔

سب سے پہلے جس امر کی تحقیق لازم ہے وہ یہ ہے کہ آیا ساری دنیا کے مسلمانوں میں ذہنی تخلیق سے گریز کرنے کے لئے کوئی مشترکہ احساس پیدا ہوا تھا یا نہیں۔ اگر ان میں ایسا کوئی احساس پیدا نہیں ہوا تھا تو ان پر جو جمود مسلط ہوا وہ یا تو اس بات کا ثبوت ہو سکتا ہے کہ خود ان کی ثقافت میں انحطاط و زوال آگیا جیسا کہ اکثر مغربی مؤرخین اور علمائے انسانیات (ANTHROPOLOGISTS) کا خیال ہے اور یا وہ اضطراب جو آج کل مسلمانوں میں پایا جاتا ہے۔ اور جسے ان کی "نشاۃ ثانیہ" سے تعبیر کیا گیا ہے محض ایک فریبِ نظر ہے۔

بحث کے خدوخال

دین اسلام کے تحفظ کے بارے میں اس زمانے میں جب یہ مسئلہ درپیش تھا مسلمانانِ عالم کے طرزِ فکر میں بالعموم یکسانیت پائی جاتی تھی۔ اس یکسانیت کی چار بڑی وجوہ تھیں۔ پہلی وجہ یہ تھی کہ ان کی فکر و عمل کا سرچشمہ ایک ہی تھا۔ یعنی خدا اور اس کے رسولؐ کی اطاعت اور ان کے دین کی حفاظت۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ تعلیم کے طریقے مسلمانوں کو عربوں سے ورثے میں ملے تھے اور ان تمام علاقوں میں جہاں مسلمان آباد تھے یا ان کی حکومتیں قائم تھیں بنیادی طور پر وہی طریقے رائج تھے۔ چنانچہ ان کے طرزِ خیال میں بڑی یکسانیت تھی۔ تیسری وجہ وہ مشترکہ مصائب تھے جو مدتوں ان کی تشویش کا موجب بنے رہے۔ پہلی مصیبت جس نے دین کو خطرے میں ڈال دیا تھا نویں صدی میں یونانی فلسفے کے مطالعہ کے بعد پیش آئی تھی۔ اس پر کسی نہ کسی طرح قابو تو پا لیا گیا تھا لیکن مسلمانانِ عالم کو ان تمام علوم کو مسترد کرنے کی فکر دامن گیر ہو گئی جن کے مطالعہ سے ان کا تصورِ کائنات مسخ ہو جانے کا اندیشہ ہوتا تھا۔ دوسری تباہ کُن مصیبت جس کا مسلمانانِ عالم کو سامنا کرنا پڑا وہ تیرھویں صدی میں تاتاریوں کی یلغار تھی۔ جس نے تمام عالمِ اسلام کو ہلا کر رکھ دیا۔ مسلمانوں کو محسوس ہوا کہ ان کے پاس

ان کے دین کے سوا کوئی بھی قابلِ قدر سرمایہ باقی نہیں بچا۔ چنانچہ انہوں نے جان لیا کہ تباہی سے جان بر ہونے کے لئے ہر قیمت پر دین کا تحفظ ضروری ہے۔ ان حالات میں کسی قسم کے اجتہاد کی اجازت نہیں دی جا سکتی تھی۔ اس معاملہ میں دنیا بھر کے مسلمان متفق تھے۔ چوتھی وجہ ان کا یہ تجربہ تھا کہ ذہنی سرگرمیوں اور تخلیقی مشاغل کو ترک کرنے کی جو راہ اُنہوں نے اپنے لئے متعین کی تھی وہ ان کے لئے مفید ثابت ہوئی اور اس کے اختیار کئے جانے کی تاریخ سے لے کر اٹھارویں صدی عیسوی تک اس کی وجہ سے اُنہیں کوئی دنیوی نقصان نہیں ہوا۔

اس نظریئے کی تائید میں کہ مسلمانوں کا ذہنی جمود اسلامی ثقافت کی کسی کمزوری کا نتیجہ نہیں تھا جو پانچویں دلیل پیش کی جا سکتی ہے اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ مسلمانوں نے ذہنی تخلیق کے سوا زندگی کے تمام شعبوں میں قوتِ محرکہ کا ثبوت دیا۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ اپنی تمام تر کوتاہیوں اور کمزوریوں کے باوجود وہ آج بھی مغربی طاقت و ثقافت کے ہر چیلنج کا دندان شکن جواب دینے کے اہل ہیں سوائے سائنسی ایجادات اور اختراعات کے میدان کے۔ اگر اسلامی ثقافت بے جان ہو چکی ہوتی تو گذشتہ دو سال کی شکستوں اور ناکامیوں کے بعد مسلمان مغربی ثقافت کے مقابلہ میں خم ٹھونک کر میدان میں آنے کا بیڑا نہ اُٹھا پاتے۔ جیسا کہ وہ آج کر رہے ہیں۔

اس ضمن میں اشتراکیت یا اشتمالیت کو کوئی ممتاز حیثیت دینے

کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ وہ مغرب کے لئے بھی ایک چیلنج ہے۔ علاوہ ازیں وہ مغربی مادیت اور لادینیت کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ جس طرزِ زندگی کو وہ پیش کرتی ہے وہ اپنی ظاہری شکل میں اسلامی معاشرہ سے قریبی مشابہت رکھتی ہے لیکن اندر سے کھوکھلی ہے۔ اشتراکیت درحقیقت ایک مذہب ہے البتہ اس کا خدا مادہ ہے اور اس کی آخرت دنیاوی فتح ہے۔ اب تک اس کو بہت کامیابی ہوئی ہے تاہم ایک مذہب ایک دین یا طرزِ زندگی کی حیثیت سے اس کی عمر نصف صدی سے زیادہ کی دکھائی نہیں دیتی۔ ایک طاقت کی حیثیت سے اس کے مغربی وضع قطع اختیار کر لینے کا زیادہ سے زیادہ امکان ہے۔ اس کے بعد اس کا اور مغربی تہذیب کا انجام مشترک معلوم ہوتا ہے۔ درحقیقت اشتراکیت اور اسلام قطعی جدا چیزیں ہیں۔

طرزِ استدلال

یہ ایک جملۂ معترضہ تھا۔ ہمارا اصل مضمون تو یہ ہے کہ اسلامی ثقافت میں زبردست تخلیقی صلاحیت ہے۔ لیکن مسلمانوں نے اس کو ذہنی اختراعات اور ایجادات کے لئے جان بوجھ کر استعمال نہیں کیا۔ اس نظریہ کو ثابت کرنے کے لئے چار مندرجہ ذیل دلائل پیش کی جائیں گی۔

(۱) اول۔ ایک ایسے ممتاز مؤرخ ثقافت اور ایک ایسے سربرآوردہ ماہر انسانیات کے خیالات کا جائزہ لیا جائے گا۔ جو ہمارے نظریئے کے بالکل برعکس ہیں۔

(۲) دوم۔ مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے بارے میں مسلمانوں کے مختلف طبقوں میں آج کل جو شکوک و شبہات پائے جاتے ہیں ان پر غور کیا جائے گا۔

(۳) سوم۔ سائنس کے مطالعہ کے بارے میں اسلام کے مزاج کی وضاحت کی جائے گی۔

(۴) چہارم۔ ذہنی جمود کی پالیسی کو مجموعی حیثیت سے اختیار کرنے کے بارے میں۔ جن چار اسباب کا اوپر ذکر کیا گیا ہے نیز سلسلہ واقعات سے جس قوتِ محرکہ کا ثبوت آج کل ملتا ہے اس کی مختصر تشریح مسلمانوں کی تاریخ کو تین حصوں میں تقسیم کر کے کی جائے گی۔ اور پانچویں دلیل پر جن اعتراضات کا امکان ہے اُنہیں بیان کر کے ان کا جواب دیا جائے گا۔

(۱)

(مخالف خیالات)

ایک جدید مؤرخ آسولڈ اسپنگلر (OSWALD SPENGLAR)

اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ اسلامی ثقافت اپنی جوان طاقتی سے محروم ہو چکی ہے اور علم الانسان کے ایک عالم اے۔ ایل کروئیبر (A.L.KROEBER) کا بھی یہی خیال ہے کہ اسلامی ثقافت کے جگہ کی آگ بجھ چکی ہے چنانچہ اب اس ثقافت کے جسم اور دل میں جان باقی نہیں رہی۔ اس بارے میں میں اپنی ناچیز معلومات کی بنا پر یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ان دونوں علماء نے اور کسی اور معاشرتی سائنسدان نے اس امر کو کبھی ملحوظ نہیں رکھا کہ مسلمانوں نے ذہنی جمود مصلحتاً اختیار کیا تھا۔ اس مصلحت کوشی کو ان کے ذہنی جمود کا سبب قرار دینے کی طرف کسی نے کوئی توجہ نہیں کی۔ حالانکہ ہزار یا آٹھ سو برس سے علمائے اسلام کی کتب ان ہدایات سے پُر ہیں کہ ہر قسم کی اختراع اور جدت کا راستہ خطرات سے پُر ہے۔ صحیح اور سیدھا راستہ تقلید کی راہ ہے۔ صدیوں سے دنیائے اسلام کی فضا ان کے وعظوں سے گونج رہی ہے کہ۔ ع

بے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید

اس سے بڑھ کر یہ کہ۔

فکر ما در کار ما آزار ما

ان نصیحتوں اور فضیحتوں کا اثر یہ ہوا کہ ایجادات اور اختراعات سے اُمت مسلمہ متنفر ہو گئی۔ اور ذہنی جمود کو ایک عمل نیک سمجھ کر اختیار کر لیا گیا۔

اسپنگلر کی رائے

اسپنگلر نے جوانی کی طاقت کے زائل ہونے کا یعنی (SENILITY) کا جو استعارہ استعمال کیا ہے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ جس طرح بڑھاپے کے بعد جوانی کے آنے کا کوئی امکان نہیں رہتا اسی طرح اسلامی ثقافت کی زائل شدہ طاقت کے عود کر آنے کا اب کوئی امکان نہیں ہے۔ لیکن رفتارِ زمانہ کے مغربی مشاہدین کی اکثریت کا خیال ہے کہ مسلمانانِ عالم میں از سرِ نو طاقت پیدا ہو رہی ہے۔ ان کے خیالات کو ان کی ظاہری قدر و قیمت کے لحاظ سے پرکھنا دانشمندی نہ ہو گی۔ کیونکہ سیاسی وجوہ کی بنا پر بعض اوقات اسی طرح کی مبالغہ آرائی کی جاتی ہے۔ چنانچہ عربوں کی دولت کو مشتہر کرنے میں ایسے ہی مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔ تاہم ان میں سے اکثر خیالات کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ بے بنیاد نہیں ہیں۔ ان میں سے بعض کا حوالہ آگے چل کر دیا جائے گا۔ اسپنگلر کے تجزیے سے واضح ہوتا ہے کہ جب کسی ثقافت کی تمام تر صلاحیتیں ایک بار بروئے کار آجاتی ہیں اور وہ اپنے عروج کو پہنچ جاتی ہے تو اس کا زوال لازمی ہو جاتا ہے۔

مسلمانانِ عالم کے ذہنی ارتقار کے بارے میں بارہویں سے اٹھارویں صدی عیسوی تک متعدد مسلم مفکرین نے جو کچھ لکھا ہے اس کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ انہوں نے پورے تیقن کے ساتھ اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ مسلمانوں کا ذہنی ارتقار پہلی چھ

صدیوں میں اپنے عروج پر پہنچ گیا تھا اور وہ یہ نعرہ لگانے لگے تھے کہ
کہ اب مزید اجتہاد کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔ نہ اب کوئی ایسا نیا
مسئلہ پیدا ہو سکتا جسے سابقہ تجربات اور امثال کی روشنی میں حل
نہ کیا جا سکے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ آیا ان کے اس دعوے کا اسپنگلر کو
علم تھا یا نہیں لیکن جنہیں اس کا علم ہے وہ اس کی اس رائے سے
یقیناً اتفاق کریں گے کہ عروج کے بعد لازمی زوال کا جو نظریہ اس نے
پیش کیا ہے اس کا اطلاق خود مسلمان کے بیانات کے مطابق ان پر
ہوتا ہے۔ لیکن یہ نتیجہ صرف اسی صورت میں اخذ کیا جا سکتا ہے جب
اجتہاد نہ کرنے کے اعلان میں پابندی کی جو مصلحت تھی (اور جو
ان کے تمام نعروں۔ اقوال اور بیانات میں مضمر تھی) اس کو نظر انداز
کر دیا جائے۔ اگر اس کو ذہن میں رکھا جائے تو ظاہر ہو جاتا ہے کہ
یہی مصلحت اس پالیسی کے اختیار کئے جانے کا موجب ہوئی جس کا
ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

اے۔ ایل۔ کروئیبر (KROEBER) کی رائے

کروئیبر نے اسلامی ثقافت کو ایک ایسے جنگل سے تشبیہ دی
ہے جس میں آگ لگ چکی ہو اور جس کے شعلے مرکز سے دور دراز کناروں
تک پھیل گئے ہوں اس کا مفہوم یہ ہے کہ اسلام میں جو ہر طرف پھیل،

رہا تھا اور اپنی طاقت و توانائی کا ثبوت دے رہا تھا دفعتاً ایسی آگ لگی کہ اس کا مرکز جل کر خاکستر ہو گیا۔ آرنلڈ جے ٹوائن بی (ARNOLD J. TOYNBEE) نے اس تشبیہہ کو "اسلام سے عیسائیوں کے تعصب کا ایک نمونہ" قرار دیا ہے جس سے کروئیر کا ذہن متأثر ہوا تھا۔ ٹوائن بی نے مزید لکھا ہے کہ۔

"تاتاریوں کے ہاتھوں جنوب مغربی ایشیا کی تباہی اور اس کے بعد چودھویں صدی میں یورپ کے بحری راستوں کو لیوانت اور بحیرۂ احمر سے پھیر دینا دو ایسے واقعات ہیں جو اس امر کی وضاحت کرتے ہیں سولہویں۔ سترہویں اور اٹھارویں صدیوں میں جنوب مغربی ایشیا اور مصر پر زوال آچکا تھا اور وہ گھنا گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انیسویں صدی میں اس خطہ کی بحالی ایک زیادہ ممتاز اور مؤثر واقعہ بن گئی۔ اس عارضی گھن اور اس کے بعد کی اہمیت اس ضمن میں یہ ہے کہ یہ دونوں واقعات اسلام کے دورِ عروج کے بعد کے ہیں۔ یہ تاریخی حقیقت کروئیر کے اس فرضی دعوے کو بالکل رد کر دیتی ہے کہ اسلام بجر مردار کا ایک پھل ہے جو بنجر زمین میں پیدا ہوا۔"[1]

---

[1] اے۔ جے ٹوائن بی اے اسٹڈی آف ہسٹری (تاریخ پر ایک نظر) آکسفورڈ یونیورسٹی پریس لندن۔ ۱۹۶۱ء۔ جلد ۱۲۔ صفحہ ۴۷۵

اسلامی ثقافت کے بارے میں اسپنگلر اور کر دیئر کی اس تشخیص کو کہ وہ ضعیف ہو گئی ہے یا اس کا شعلۂ حیات گل ہو چکا ہے صحیح تسلیم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس سے مسلمانوں کے ان کارناموں کی توجیہہ نہیں ہوتی جو مسلمانوں نے قیامِ سلطنت۔ فنون، تعمیرات اور تبلیغِ دین جیسے شعبوں میں انجام دیئے۔ ان شعبوں کو کسی صورت سے بھی انسانی زندگی کے فروعی شعبے نہیں کہا جا سکتا۔ ان میں جو نمایاں کامیابیاں دنیائے اسلام نے حاصل کی ہیں ان کو یہ کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ثقافتِ اسلامی کا دل تو جل چکا تھا۔ اب فقط کنارے سلگ رہے تھے۔ اس کے علاوہ دنیائے اسلام میں آج کل جو مزید نئی توانائی نمایاں ہے اس کی کیا وجہ ہے؟ اگر اسلامی ثقافت میں جان باقی نہ رہی ہوتی تو پچھلی تین صدیوں کے ناسازگار حالات و واقعات کے باعث اس کی بحالی تو در کنار اس کا پنپنا ہی مشکل ہو جاتا۔ ثقافت کا کوئی طالب علم اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکار نہیں کر سکتا کہ سیاسی اقتدار کا نشیب و فراز۔ دولت کا حصول و ضیاع اور علوم و فنون کی ترقی و تنزل ثقافت کی کامیابی اور ناکامی کے قابلِ اعتبار ثبوت تو ہیں لیکن ان واقعات سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کی اساسی طاقت داخلی طور پر کمزور یا زائل ہو گئی ہو۔ مسلمانوں کی تاریخ کی ایک قابلِ ذکر خصوصیت یہ ہے کہ مسلمانوں کے کسی ایک خطے میں

اگر مکمل انحطاط ہوا بھی ہے تو دوسرے خطے میں فوراً ہی از سرِ نو جان پڑ جانے اور اس کے طاقتور بن جانے کا ثبوت ملا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اکثر و بیشتر صورتوں میں ایسی نمایاں سرگرمیاں معرضِ وجود میں آئی ہیں جن سے طاقت و قوت کے علاوہ اسلام کی سربلندی و سرفرازی کا اظہار ہوا ہے۔

مسلمانوں کی تاریخ اور مسلمانوں کی ثقافت کو مجموعی نظر سے دیکھنا چاہیئے۔ مسلمانوں کی خطہ وار تاریخ کو مسلمانوں کی مجموعی ثقافت کی تاریخ نہیں سمجھنا چاہیئے۔ اگر فلپ کے ہٹیؔ نے دنیا کی مسلم آبادی کے ہر جزو اور مسلمانوں کے ہر ملک پر جس میں وہ آباد ہیں یا حکومت کرتے ہیں الگ الگ نظر ڈالی ہوتی تو وہ سنہ ۱۹۶۸ء میں یہ کبھی نہ لکھتا کہ۔

"موجودہ دنیا میں اسلام نے ایک زندہ قوّت ہونے کا ثبوت دیا ہے اور وہ آج بھی مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک ایک زندہ قوت اور کروڑوں انسانوں کا طرزِ زندگی ہے[1]۔"

ول ڈیورینٹ (WILL DURANT) جسے مسلمانوں کی تباہی اور بربادی کے باعث جو ۱۲۵۸ء میں تاتاریوں کے ہاتھوں ہوئی تھی

---

[1] فلپ کے ھٹی۔ دی عربس۔ اے شارٹ ہسٹری (عربوں کی ایک مختصر تاریخ) میکملن اینڈ کمپنی لمیٹڈ۔ لندن۔ طبع چہارم۔ صفحہ ۵

مسلمانوں کی ثقافت کے لئے لوح مزار لکھنے کی ترغیب ہوئی تھی۔ وہ اگر مسلمانوں کے علاقائی حالات ہی کا مطالعہ کرتا رہتا تو ۱۹۵۰ء میں یہ نہ لکھتا کہ۔

"اسلام آج تک نصف دنیا میں ایک زبردست طاقت کی حیثیت رکھتا ہے[1]۔"

•

۲

(مسلمانوں کا نقطۂ نظر)

یہ بات تعجب خیز سہی لیکن ایک حقیقت ہے کہ مسلمان عام طور سے خود ہی اپنے نشاۃ ثانیہ کے بارے میں شک و شبہ میں مبتلا ہیں۔ ان میں سے اکثر اپنے پریشان کن مقامی مسائل میں اُلجھے ہوئے ہیں اور اس تشویش نے اسلام کے بارے میں ان کے تصورات کو متاثر رکھا ہے۔ ایک طرف یہ کوتاہ بینی اور دوسری طرف مسلمانوں کے مخالف عناصر چن چن کر مسلمانوں کی کمزوریوں کو مشتہر کرتے رہتے ہیں تاکہ اُمتِ مسلمہ کی ہمتیں پست ہوں۔ مثلاً کبھی اسلام کو خونخوار

---

[1] (WILL DURANT) وِل ڈیورینٹ۔ اسٹوری آف سیویلیزیشن (تہذیب کی کہانی) سائمن اینڈ شسٹر۔ نیو یارک۔ جلد دی ایج آف فیتھ صفحہ ۲۱۷

بتایا جاتا ہے تو کبھی چار شادیوں کو آوارگی سے بدتر کر کے دکھایا جاتا ہے۔ یہ صداقت نہیں کدورت ہے۔

حق سے اگر غرض ہے تو زیبا ہے کیا یہ بات۔
اسلام کا محاسبہ، یورپ سے درگذر؟

لیکن مغربی ذرائع ابلاغ کی طاقت کا یہ ثبوت ہے کہ خود کروڑوں مسلمان اس سے متاثر ہیں جو راسخ العقیدہ مسلمان ہیں ان میں سے اکثر کا مطمح نظر یہ ہے کہ ہر ایک مسلمان ایک کامل انسان ہو اور کامل انسان کا تصور ان کے ذہن میں یہ ہے کہ اس کی روز مرہ کی زندگی بے داغ اخلاق کا نمونہ ہو نیز وہ مذہبی احکام پر حرف بحرف عمل کرے۔ ان میں سے بعض اصحاب یہ بھی سمجھتے ہیں کہ پہلے ۳۰ سالہ دور کے سوا جو چوتھے خلیفہ راشد کی شہادت کے بعد ۶۶۱ء میں ختم ہو گیا باقی تمام ادوار غیر اسلامی رہے ہیں۔ مسلمانوں کی روحانی تاریخ یا ان کے عقائد کی تاریخ لکھنے والوں کے لئے اس قسم کے حقائق کلیدی اہمیت ضرور رکھتے ہیں لیکن ثقافت کی تاریخ قلم بند کرنے والوں کے لئے لازم ہے کہ اس فرق کو ملحوظ رکھیں جو روحانی۔ معتقداتی۔ اخلاقی۔ معاشرتی۔ سیاسی۔ اقتصادی تاریخوں اور ثقافتی تاریخ میں ہے۔

ثقافت سے قریب ترین رشتہ تہذیب کا ہے۔ تہذیب کو ثقافت کا بیرونی مظہر کہا جا سکتا ہے اور ثقافت کو ان داخلی قوتوں کا مجموعہ

کہا جا سکتا ہے جو انسان کے طرزِ عمل کا تعین کرتی ہیں اور معاشرتی سرگرمیوں کی رہنمائی کرتی ہیں۔ ایک اعلیٰ مذہبی معاشرے میں یہ قوتیں مذہب کی عمیق ترین تحریک سے پیدا ہوتی ہیں اور اس کی ثقافت کی من حیث الکل تشکیل کرتی ہیں۔ ہر قسم کے روحانی تجربات اس تحریک میں مدد دیتے ہیں لیکن ہمیں اپنے موجودہ دائرۂ بحث کے لحاظ سے فقط مذہب کی اساسی تحریک ہی سے سروکار ہے۔ ان روحانی تجربات سے واسطہ نہیں ہے جو لوگوں کو براہِ راست ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں اعتقادات کے اختلافات بھی ہمارے دائرۂ بحث سے خارج ہیں۔ ہمارا مقصد ایک وسیع نقطۂ نظر سے اسلامی ثقافت کی طاقت کا جائزہ لینا ہے اور اس بات کو واضح کرنا ہے کہ موجودہ اسلامی ثقافت سابقہ اسلامی ثقافت کی روح سے گہرا اور مضبوط جذباتی رشتہ رکھتی ہے۔ یہ ثقافت دنیا بھر کے مسلمانوں کے لئے فکر و عمل کی تحریک کا واحد قابل اعتبار ذریعہ ہے۔ راسخ العقیدہ مسلمان اس حقیقت کے قائل ہیں۔ کہ مسلمانوں کی ثقافت کی بنیاد اسلام ہے۔ اس کے برعکس مغرب اپنے جدید مبہم تغیر پذیر مسلک پر نازاں ہے۔ بعینہٖ ہندوستان لادینیت کا سیاسی مسلک اپنا رہا ہے اور اس کا دعویٰ ہے کہ وہ ایک لادینی مملکت ہے اور چین اپنے ماضی سے تقریباً متنفر ہے۔ مگر ہمارا نقطۂ نظر راسخ العقیدہ مسلمانوں کے نقطۂ نظر کی طرح یہی ہے کہ مسلمانوں کی ثقافت کی بنیاد اسلام ہے۔ اُن مسلمانوں کے خیالات مختلف ہیں جو مغرب سے بہت زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔

ان کے دو گروہ ہیں۔ ایک گروہ کے علمبردار یہ چاہتے ہیں کہ جس ملک میں وہ رہتے ہیں اسے وہی آسائشیں۔ خوش حالی۔ تعیش۔ طاقت اور وقار حاصل ہو جو دنیا کے سربر آوردہ ممالک کو حاصل ہے۔ دوسرا گروہ مارکسی اشتراکیت کو درآمد کر کے اس کے ذریعے پسماندگی کی لعنت سے جلد از جلد گلو خلاصی حاصل کرنے کا خواہش مند ہے۔ ان دونوں گروہوں کا خیال ہے کہ سارے مشرق کو اپنی ثقافت تبدیل کر دینا چاہیئے۔ ان کو یہ دیکھ کر بڑی مایوسی ہوتی ہے کہ مسلمانوں کی آبادی کا سوادِ اعظم اسلام سے، جو ان کی ثقافت کی اساس ہے، اپنی والہانہ وابستگی ترک کرنے سے ہمیشہ انکار کرتا ہے۔ ان دونوں گروہوں کی یہ مایوسی خود اس بات کا ثبوت ہے کہ مسلم ثقافت کی جڑیں بہت گہری اور مضبوط ہیں۔ اتنی گہری کہ رسم و رواج اور نمائشی عبادات تک ان کے لئے خس و خاشاک کی مانند ہیں اور اتنی مضبوط کہ وہ اپنی نمو کے لئے کائنات سے ہر لحظہ نئی توانائی حاصل کرتی ہیں۔ بظاہر جو جمود نظر آتا ہے وہ جڑوں سے اوپر ہے ان کے اندر نہیں ہے۔ اس کے ذمہ دار مالی ہیں نہ بیج ہے اور نہ جڑیں ہیں۔

(۳)

(سائنس اور اسلام)

آج کل اسلامی فکر کے ایک قابل ترین مبلغ سید حسین نصر جو

بذاتِ خود ایک مستند سائنسدان ہیں اور اس بات پر اعتقاد رکھتے ہیں کہ اسلامی تہذیب کی نشاۃ ثانیہ مستقبل قریب میں ہونے والی ہے۔ اپنی کتاب "اسلام میں سائنس اور تہذیب" کی تمہید میں لکھتے ہیں کہ:-

"جب اسلام کی الہامی تعلیمات نے گذشتہ تہذیبوں کے ورثے کو یکجا کر لیا اور اپنی خصوصیات کی وساطت سے ایک ایسی تہذیب کو مرتب کر دیا جس کو واضح طور پر اسلامی جذبہ کا مظہر کہا جا سکتا ہے تو پھر اصل توجہ کا رُخ تغیر و تبدل، تصرف و توافق کی طرف سے مڑ گیا۔"

مندرجہ بالا بیان سے یہ ترشح ہوتا کہ گویا اسلامی تہذیب میں نمو کی قوت زائل ہو گئی۔ مگر یہ بات نہیں کھلی کہ اس قول کا اطلاق اسلامی تاریخ کے کس دور پر ہوتا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کا اطلاق اس دور پر تو نہیں ہوتا جس میں خود مصنف کی مذکورہ کتاب کے باب اول کے مطابق اسلامی سائنس کی آفاقی شخصیتوں نے انسانی علم میں درخشاں اضافے کئے۔ مصنف کے خیال میں وہ عظیم الشان اشخاص یہ تھے۔

"جابر ابن حیان (۷۲۱ تا ۸۱۵)۔ ابو یوسف یعقوب ابن اسحٰق الکندی (۸۰۱ تا ۸۷۳)۔ حنین ابن اسحٰق

(۸۱۰ تا ۸۷۷)۔ ثابت بن قرہ (۸۲۶ تا ۹۰۸)۔ محمد ابن موسیٰ الخوارزمی (متوفی ۸۶۳ئہ) ابو نصر الفارابی (۸۷۰ تا ۹۵۰)۔ ابوالحسن المسعودی (متوفی ۹۵۶ئہ)۔ ابو علی الحسین ابن سینا (۹۸۰ تا ۱۰۳۷) ابو علی الحسن ابن الہیثم (۹۶۵ تا ۱۰۳۵) ابو ریحان البیرونی (۹۷۳ تا ۱۰۵۱)۔ ابوالقاسم مسلمہ المجریتی (متوفی ۱۰۰۷ئہ) ابو حامد محمد الغزالی (۱۰۵۸ تا ۱۱۱۱)۔ ابوالفتح عمر ابن ابراہیم الخیامی (عمر خیام) (۱۰۳۸ تا ۱۱۳۲)۔ ابوالولید محمد ابن رشد (۱۱۲۶ تا ۱۱۹۸)۔ نصیر الدین الطوسی (۱۲۰۱ تا ۱۲۷۴)۔ قطب الدین الشیرازی (۱۲۳۶ تا ۱۳۱۱)۔ عبدالرحمٰن ابو زید ابن خلدون (۱۳۳۲ تا ۱۴۰۶)۔ بہاؤالدین الآملی (۱۵۴۶ تا ۱۶۲۱)۔[1]

ان مشہور اشخاص میں سے زیادہ تر کا تعلق نویں تا گیارہویں صدیوں سے ہے ان میں علمائے دین۔ مترجمین۔ فلاسفہ۔ ہیئت داں۔ ریاضی داں۔ طبعیات داں۔ حیوانیات داں۔ عینیات داں۔ اطبا۔ جغرافیہ داں۔ مؤرخین اور عام سائنس داں سب ہی شامل

---

[1] سید حسین نصر۔ سائنس اینڈ سیویلیزیشن ان اسلام۔ ہارورڈ یونیورسٹی پریس کیمبرج (میساچسٹ) ۱۹۶۸ئہ صفحات ۴۲ تا ۵۷

تھے۔ ان میں موجد بھی تھے اور مفکر بھی۔ خالص سائنس کے علمار بھی تھے اور موجودہ مغربی سائنسی دور کے پیش رو بھی۔ ان کے کارناموں کا علم جب یورپ کو ہوا تو وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ راجر بیکن (ROGER BACON) نے تیرہویں صدی میں لکھا تھا کہ عربی زبان کا علم طبیعی سائنسی علوم کے مطالعہ کے لئے ناگزیر ہے۔ ان میں سے بعض نے یونانی مابعدالطبیعات کی تحصیل کی تھی جو وحی والہام کے منافی تھی۔ چنانچہ ان میں سے بعض نے اس علم کی تحصیل کے خلاف شدید ردِ عمل اظہار کیا تھا۔ مصنف موصوف (سید حسین نصر) کا یہ قول کہ اسلام کی الہامی تعلیمات پر اعتقاد نے تغیر اور توافق سے دلچسپی ختم کردی تھی۔ غالباً ان اشخاص پر اور اس روح تخلیق پر تو صادق نہیں آتا جو اس پورے دور میں جاری وساری نظر آتی ہے۔ مسلمانوں نے جیسا کہ مصنف موصوف نے خود بتایا ہے فلسفۂ یونان کی طرف توجہ اس لئے کی تھی کہ انہیں اسلام کے خلاف عیسائی اور یہودی علمائے دین کے اعتراضات کے جواب دینے کے ذرائع حاصل ہو سکیں۔ انہیں اس فلسفہ میں جس کا علم ان کے مخالفین کو نہ تھا یہ ذرائع مل گئے۔ لیکن وہ فلسفہ ان میں سے بعض کے لئے انحرافی فکر وعمل کا محرک بن گیا اور انہوں نے اور ان کے اس محرک فلسفہ نے فکر اسلامی کے لئے ایک بڑا خطرہ پیدا کردیا۔ اچھے مسلمان اس خطرے کا سدباب کرنے کی طرف فوراً مائل ہوئے۔ امام غزالی نے بالآخر اس پر فتح پائی لیکن انہیں بڑی احتیاط سے کام لینا پڑا جن

احتیاطوں کے برتنے کی انہوں نے تلقین کی ان کا ذکر آگے چل کر کیا جائے گا۔ لیکن تصوف پر زور دینے سے اور ذاتی مدافعت میں لوگوں کو مشتعل کر دینے کے باعث وہ احتیاطیں جن کی انہوں نے تلقین کی بھی ملحوظ نہ رکھی جا سکیں اور غلطی سے امام غزالی کو سائنس کا مخالف سمجھ لیا گیا۔

سید حسین نصر کی مندرجہ بالا عبارت ابہام اس وجہ سے پیدا کرتی ہے کہ انہوں نے اسلامی تصور کائنات پر زور دے کر اسلامی تہذیب کی مدافعت اور مسلمانوں کے ذہنی جمود کی وضاحت کا دوہرا کام بیک وقت سر انجام دیا ہے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ وحدت کا تصور جو اسلام کی الہامی تعلیم کا روح رواں ہے ایک ایسی شخصیت یا ذہنیت کو جنم دیتا ہے جو:

"اپنے متعدد کارناموں میں سے کسی ایک کو بھی اس طرح انجام نہیں دے سکتی جس طرح ایک یک رخا ماہر خصوصی انجام دیتا ہے۔ مسلمانوں میں بھی ایسے ماہر خصوصی موجود ہیں لیکن ان کا شمار زیادہ تر ثانوی شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ ایک عالم متبحر ماہرین خصوصی "سطحی طرز واقفیت" کو اختیار نہیں کرتا۔ کیونکہ اس طرح وہ وسیع تر علم سے محروم ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان حکمائے ذہنی کارناموں کو ایک ناقابلِ تسخیر وحدت کے

عکس کے طور پر ظاہر کرتے ہیں۔ ایسی وحدت جو یونانی روایات میں ناپید ہے"[1]

اس عبارت کے اعلیٰ مفہوم کے باوجود اس سے غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کیونکہ ایک سچا مسلمان جس بصیرت کی بنا پر یک رخا ماہرِ خصوصی نہیں بن سکتا یا نہیں بننا چاہتا اس کے معنی اگر یہ ہیں کہ وہ پوری کائنات کو ایک مکمل اور مربوط نظام ایک وحدت سمجھتا ہے اور خود کو اس کا ایک جزو خیال کرتا ہے تو اس تشریح کا اطلاق بلاشبہ ہر اچھے مسلمان پر ہوتا ہے۔ لیکن اگر اس کے معنی یہ لئے جائیں کہ کوئی مسلمان اس وقت تک کسی ایک سائنس میں ماہرِ خصوصی نہیں بن سکتا جب تک کہ وہ سارے علوم پر حاوی ہو کر خود اپنے تصورِ کائنات کا آئینہ دار نہ بن جائے تو یہ تشریح غلط ہو گی۔ مسلمانوں کی تاریخ سے ممکن ہے کہ کل علوم پر حاوی ہونے کی مثالیں اخذ کی جاسکیں لیکن اس کا سبب کائنات کی وحدت کا صرف اسلامی تصور نہیں ہے، اس کی کئی اور وجوہ بھی ہو سکتی ہیں۔ ایک قابلِ قبول وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ کچھ صدیوں قبل تک علم کا ذخیرہ اتنا نہ تھا کہ وہ ایک فرد کی بساط سے باہر ہو۔ لہٰذا صاحبِ صلاحیت مسلمان ادب۔ طب بلکہ روحانی اور دنیوی علوم پر عبور حاصل کر سکتے تھے اور اس کے ساتھ

---

[1] سید حسین نصر۔ سائنس اینڈ سیویلیزیشن ان اسلام۔ ہارورڈ۔ یونیورسٹی پریس۔ کیمبرج۔ ۱۹۶۸ء۔ صفحہ ۲۹

ساتھ اپنے خصوصی شعبۂ علم کے ماہر بھی بن سکتے تھے۔ کسی خصوصی شعبۂ علم میں مہارت حاصل کرنے کے لئے یہ لازم نہ تھا کہ اعلیٰ تر علم سے شغف ترک کیا جائے۔ اگر کوئی شخص سطحی طرزِ واقفیت کو اپنا شعار بناتا تھا تو اس کے پاس ایسا کرنے کا کوئی جواز نہ تھا چنانچہ وہ ایک ثانوی شخصیت بن کر رہ جاتا تھا۔ کیونکہ معاشرے نے اعلیٰ ترین مقام صرف خداشناس شخصیتوں کے لئے مخصوص کر دیئے تھے۔ مسلمانوں کی یہ روایت کہ لبسیط علم ہوا تکی الہامی تعلیم سے محض بالواسطہ یا ضمنی تعلق رکھتی ہے۔ آج کل متعدد علوم کے ساتھ ساتھ کسی خاص شعبۂ علم میں مہارت حاصل کرنا ممکن نہیں ہے۔ ایک حکیم یا پرانے زمانے کے عالم کی جگہ اب مختلف سائنسوں کے کئی ماہرینِ خصوصی کو لینا چاہیئے تاکہ سارا معاشرہ مل کر حکیم یا عالم بن جائے۔ یہ طرزِ عمل اس قدیم طریقۂ کار کی نسبت جو علومِ متداولہ کی محدود مقدار میں اختیار کیا گیا تھا قرآن مجید کی تعلیم سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے۔ قرآن مجید کی سورت ۳ آیت نمبر ۱۱۰ میں پوری اُمت سے ارشاد ہوا ہے کہ :-

"اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لئے میدان میں لایا گیا ہے۔"

سید حسین نصر نے اپنے تبحرِ علمی کی بناء پر اپنے مذکورۂ بالا بیان کی تائید میں قرآن کریم کی دو آیات کا حوالہ دیا ہے۔ ایک آیت

دوسری سورت کی دو سو چھپیسویں آیت ہے جس میں اللہ تعالیٰ کے قادرِ مطلق اور حاضر و ناظر ہونے کا ذکر کیا ہے۔ اور دوسری چوبیسویں سورت کی پینتیسویں آیت ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے رہنمائی مہیا کرنے کے لئے اپنی قدرتِ کاملہ کو بشکلِ نور ظاہر کیا ہے اور اس امر کا انکشاف کیا ہے کہ وہ بنی نوعِ انسان سے کنایوں میں خطاب کرتا ہے۔

ان آیات کا حوالہ دینے سے ان کا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ کلام اللہ کا اثر مسلمانوں کے دماغوں پر یہ ہوتا ہے کہ وہ کُل موجودات کی وحدت کے حامل ہو جاتے ہیں۔

کوئی مسلمان ایک لمحے کے لئے بھی شک نہیں کر سکتا کہ مسلمانوں کے ذہن پر کلام اللہ کا تسلط رہا ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ انہوں نے علم کے جزوی حصول کو کبھی بدعت قرار دیا ہے۔ کسی شخص نے بھی اسلامی سائنس کے مذکورہ بالا اصحاب کے بارے میں جن کا ذکر خود سید حسین نصر نے کیا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ وہ مختلف سائنسوں کے جزوی حصول کے باعث بدعت کے مرتکب ہوئے تھے۔ ان شہرۂ آفاق شخصیتوں میں سے کسی ایک کو بھی سارے علوم پر کامل عبور تو درکنار درک تک حاصل نہ تھا جن میں اُنہوں نے علیحدہ علیحدہ مہارت حاصل کی تھی۔ اگر ان میں سے ابن سینا جیسے بعض اشخاص کو بدعت کا مرتکب قرار دیا گیا تو اس کا سبب خود ان کی خاص طرزِ فکر تھی۔ اس کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ اس قسم کا کوئی الزام

البیرونی پر اس باعث عائد نہیں کیا گیا کہ اس نے ہیئت میں مہارتِ خصوصی حاصل کی تھی۔ یا غیر جانب دارانہ عقلیت کو جو کسی اعتبار سے مذہب کے منافی نہ تھی اپنا شعار بنایا تھا۔

تمام مذاہب کے لوگوں نے سائنس کی یا تو مخالفت کی ہے یا اس کی صحت پر شک وشبہ کیا ہے۔ ان کو ہمیشہ یہ خطرہ رہتا ہے کہ اصولی سائنس مذہب کے خلاف پڑے گی۔ اصولی سائنس کے نتائج مذہب کے نہ موافق ہوتے ہیں اور نہ مخالف مگر جب مابعد الطبیعات کی بحث میں ان سے عقائد کے خلاف کام لیا جاتا ہے۔ تو سائنس کے اس استعمال کی بناء پر اہلِ مذہب سائنس پر معترض ہوتے ہیں اس کی اصل وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اس کے دلائل کا جواب نہیں دے پاتے یہ ایسی غلطی ہے جس کے مرتکب عیسائی اور مسلمان دونوں یکساں طور پر ہوئے ہیں۔ وہ جس چیز پر فی الحقیقت معترض ہوئے ہیں وہ سائنس نہیں بلکہ وہ معاندانہ فلسفہ ہے جس کی عمارت بعض سائنسی نظریات پر ان لوگوں نے تعمیر کی تھی جو قدرتِ الٰہی کے قائل نہ تھے۔

سائنس اور فلسفہ کے اس فرق کو ابو حامد الغزالی (۱۰۳۸ء تا ۱۱۱۱ء) نے واضح کیا ہے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ بہت سے مسلمانوں نے یونانی لادینی فلسفہ سے مرعوب ہو کر اسے بے چون وچرا تسلیم کر لیا ہے۔ چنانچہ اُنہوں نے فلسفے کی کمزوریوں کو مسلمانوں پر واضح

کر دیا۔ ان کا یہ اعتراض نہ اصولی سائنس پر تھا نہ سائنس کی جزوی تحقیق و تحصیل پر تھا۔ اس کے بر عکس انہوں نے یہ تلقین کی تھی کہ صحیح سائنس کے قطعی نتائج پر کوئی اعتراض نہیں کرنا چاہیئے جو لوگ سائنسی تحقیق یا صحیح سائنسوں کی مخالفت کو امام غزالی سے منسوب کرتے ہیں انہیں چاہیئے کہ ان کی کتاب تہافۃ الفلاسفہ (INCOHERENCE OF PHILOSOPHY) کی تمہید کا گہری نظر سے مطالعہ کریں۔ جن لوگوں کے نزدیک علم کا مفہوم قرآن وحدیث کے مطالعہ کے سوا کچھ اور نہ تھا انہوں نے اس کتاب کو غلط معنیٰ پہنائے ہیں۔

امام غزالی ایک ایسے عالم تھے جنہوں نے دنیائے اسلام کے دل و دماغ پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ اور آج تک ان کو مذہبی علوم کا ماہر سمجھا جاتا ہے اس لئے ان کی مذکورہ کتاب کی تمہید سے کچھ ایسی باتیں نقل کرنا مناسب ہو گا جن سے یہ واضح ہو سکے کہ ان کے نزدیک صحیح سائنسوں کی مخالفت خود دین کے لئے خطرے کا موجب تھی۔

اُنہوں نے فلسفے کی مخالفت جس وجہ سے کی اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے۔

"میرے نزدیک عوام الناس کا ایک طبقہ (یعنی فلاسفہ کے معتقدین) ایسا ہے جو (مقابلتاً) زیادہ ذہانت و بصیرت کی بنا پر خود کو دوسروں سے برتر سمجھتا

ہے۔"[1]

امام صاحب نے اس طبقہ کے احساسِ برتری کا یہ سبب بتایا ہے۔

"اُن اشخاص کی بدعت کا سبب محض یہ ہے کہ یہ یہود و نصاریٰ کی طرح ان باتوں کو جو وہ دوسروں سے سنتے ہیں یا گردوپیش دیکھتے ہیں بے چون وچرا تسلیم کر لیتے ہیں۔ وہ اس کے سوا کچھ کر بھی نہیں سکتے کیونکہ وہ ایک غیر اسلامی ماحول میں پیدا ہوئے تھے اور ان کے آباؤ اجداد کا طرزِ عمل بھی اس سے بہتر نہ تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس قسم کی بدعت نظریاتی اُدھیڑ بُن پر مبنی ہوتی ہے جو قیاسی باتوں پر بے اعتباری۔ گمراہی اور بے تکے پن سے عقلی تُکے لگانے کے سوا کچھ اور نہیں۔"[2]

امام صاحب نے صرف ان کی خیال آرائیوں اور تصورات پر اعتراض کیا ہے۔ انہوں نے تسلیم کیا ہے کہ خیال آرائی کرنے والوں نے بھی کچھ ٹھوس کارنامے انجام دیئے ہیں جنہیں نظرانداز نہیں کیا

---

[1] الغزالی۔ تہافۃ الفلاسفہ (اُردو ترجمہ از صبیح احمد کمالی) پاکستان فلاسوفیکل کانگریس لاہور ۱۹۵۵ء صفحہ ۱

[2] الغزالی۔ تہافۃ الفلاسفہ (اُردو ترجمہ از صبیح احمد کمالی) پاکستان فلاسوفیکل کانگریس لاہور ۱۹۵۸ء صفحہ ۵

جا سکتا چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ۔

"انہوں نے قوانینِ شریعت کو ماننے سے کبھی انکار نہیں کیا۔ وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان اور اس کے رسولوں پر اعتقاد رکھتے تھے لیکن جزئیات میں ان سے لغزشیں ہوئیں اور وہ بہک گئے اور دوسروں کو بھی صراطِ مستقیم سے بھٹکا دیا۔ ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ان سے لغزشوں اور غلطیوں کا ارتکاب کیوں ہوا۔ لیکن ہمارا احتساب ان کے ایسے ٹھوس کارناموں پر پردہ نہیں ڈالے گا جو ان کی عمارتِ فکر کی بنیاد میں موجود ہیں۔"[1]

مندرجۂ بالا اقتباسات سے ظاہر ہے کہ امام صاحب نے فلسفیانہ خیال آرائیوں کی تکذیب کی ہے اصولی سائنس کی نہیں۔ جن وجوہ کی بناء پر وہ فلسفہ کے مخالف تھے ان کا اطلاق سائنسی علوم پر نہیں ہوتا۔ اُنہوں نے فلسفیوں کے قیاسات کو ناقابلِ اعتبار قرار دیا ہے کیونکہ وہ نہ تو "مثبت تحقیق" پر مبنی تھے اور نہ الہام پر چنانچہ وہ کسی اعتبار سے اس قابل نہ تھے کہ اُنہیں واجب الاحترام سمجھ کر قبول کیا جائے۔ وہ فرماتے ہیں کہ:۔

"ہم اپنی توجہ ان نظریات کے تضاد پر مرکوز کریں گے جن

---

[1] الغزالی۔ تہافۃ الفلاسفہ (اُردو ترجمہ از صبیح احمد کمالی) پاکستان فلاسوفیکل کانگریس لاہور۔ ۱۹۵۸ء صفحہ ۳

کا تعلق اس مشہور فلسفی سے ہے جسے ابو الفلاسفہ یا استاد اول کہا جاتا ہے کیونکہ اس نے ان کے (یونانیوں کے) سائنسی علوم میں سے وہ چیزیں خارج کر کے جو فلاسفہ کے نزدیک غیر ضروری تھیں اور ان چیزوں کو برقرار رکھ کر جو فلسفیانہ فکر اور رجحانات سے قریب تر تھیں، اُنہیں منظم اور از سر نو منضبط کیا ہے۔ یہ فلسفی ارسطو تھا جس نے اپنے تمام پیش رو فلسفیوں کو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ ان میں خود اس کا استاد افلاطون بھی شامل تھا جسے مقدس فلسفی کہا جاتا ہے۔ افلاطون سے انحراف کی معذرت ارسطو نے ان الفاظ میں کی ہے۔ "افلاطون مجھے عزیز ہے لیکن حق افلاطون سے عزیز تر ہے۔"

"ہم نے یہ واقعہ اس بات کو واضح کرنے کے لئے بیان کیا ہے کہ خود ان کے (یونانیوں کے) خیال میں فلاسفہ کے موقف میں کوئی بات پائیدار اور مستقل نہیں تھی۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے مابعد الطبیعاتی نظریات کے حقائق کو علوم ریاضی و منطق کے واضح اصولوں سے اخذ کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ طریقہ بعض اوقات کم عقل لوگوں کو مطمئن کر دیتا ہے لیکن اگر ان کے

مابعد الطبیعاتی نظریات اتنے معقول اور قطعی ہوتے
جتنا کہ ان کا علم ریاضی ہے تو مابعد الطبیعاتی مسائل
پر بھی ان میں آپس میں اسی طرح اختلاف نہ ہوتا جس
طرح ریاضی کے مسائل پر نہیں ہے۔"[1]

مندرجۂ بالا اقتباسات غزالی کو اس الزام سے جوان پر (سید حسین نصر نے تو نہیں لگایا لیکن) عام طور سے عائد کیا جاتا ہے کہ وہ علوم طبیعی کے عادتاً اکتساب کے مخالف تھے بری الذمہ قرار دینے کیلئے کافی ہونے چاہئیں۔ اُنہوں نے یک رخی تحقیق کی مخالفت نہیں کی اور اور نہ قرآن کریم میں اس مخالفت کا کوئی جواز ہے۔

امام صاحب نے مسلمانوں کو صحیح سائنسی علوم کی مخالفت سے باز رکھنے کے لئے جو تنبیہہ کی ہے وہ حیرت انگیز ہے۔ اسے نقل کرنے سے پہلے بہتر ہوگا کہ اس سند سے اعلیٰ سند یعنی خود کلام الٰہی کی طرف ہم رجوع کریں۔ اگر تاریخی اعتبار سے بعض ایسے ادوار گذرے ہیں جن میں مسلمانوں کے ذہن پر اس خیال کا تسلط رہا کہ خالص علوم سائنس کا مطالعہ ممنوع ہے تو یہی فرق ان ادوار کی اسلامی تہذیب اور اسلامی تمدن کی موجودہ نشاۃ ثانیہ میں ہے۔ قرآن حکیم ہمیں بتاتا ہے کہ انسان کا علم نامکمل ہے۔ (سورت ۱۷، آیت ۸۵)۔ چنانچہ نبی کریم صلے اللہ

---

[1] الغزالی۔ تہافۃ الفلاسفہ (اردو ترجمہ از صبیح احمد کمالی) پاکستان فلاسوفیکل کانگریس۔ لاہور۔ ۱۹۵۸ء۔ صفحہ ۴

علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ :-

"میرے پروردگار میرے علم میں اضافہ فرما"

(۲۰ : ۱۱۴) غالباً دوسروں کو سبق دینے کے لئے فرمایا گیا ہے۔ قیاس آرائی اور تخمین وظن سے منع کیا گیا ہے (۵۳ : ۲۸) انسان کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ روزمرہ واقعات اور اہم مسائل مثلاً تخلیقِ کائنات پر غور و خوض کرے (۳۰ : ۲۲ — ۲۳) اہل ایمان کو تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ اندھوں اور بہروں کی طرح وحی تک پر بھی "نہ گریں" (۲۵ : ۷۳) بنی نوعِ انسان کو یقین دلایا گیا ہے کہ کائنات کو (یکساں قوانین کا) پابند کر دیا گیا ہے تاکہ انسان (اسے مسخر کرنے کے) قابل ہو جائے (۲۵ : ۱۳) اور وعدہ کیا گیا ہے کہ آیات الٰہی اُس وقت تک (بتدریج) ظاہر ہوتی رہیں گی جب تک کہ حق بنی نوعِ انسان پر واضح نہ ہو جائے (۵۳ : ۱۴) اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک انسان اپنی کوششوں سے ان آیات یا نشانیوں کے ذریعہ حق شناس نہیں بنتا نظریات معرضِ وجود میں آتے رہیں گے جن سے انسان کو خائف نہیں ہونا چاہیئے۔ اور جنہیں واجب الاحترام بھی نہیں سمجھنا چاہیئے جیسے کہ نویں صدی عیسوی میں بعض مسلمان فلسفۂ یونان سے خائف ہو گئے تھے اور اسے واجب الاحترام سمجھنے لگے تھے۔ مسلمانوں کو ان نظریات کے استعمال سے گریز بھی نہیں کرنا چاہیئے۔ سائنس طبیعی دنیا کی تحقیق کا محض ایک طریقہ ہے۔ یہ طریقہ اس عقیدے پر مبنی ہے کہ

فطرت یکساں اور ہمہ گیر قوانین کے تابع ہے۔ بنی نوعِ انسان کو آج جو چیلنج در پیش ہیں۔ ان سے نمٹنے کے لئے اسلام کی قوتِ محرکہ کو آئندہ غالباً اس قسم کا طرزِ عمل اختیار کرنا ہو گا۔ ایک سچے مسلمان کو ان سے گھبرانا نہیں چاہیئے۔ ان کی وجہ سے اس کا حوصلہ پست ہونے کے بجائے اور بلند ہونا چاہیئے۔ (۳ : ۱۷۲)

علوم جدیدا اسلام کے لئے بذاتِ خود کوئی چیلنج نہیں ہو سکتے بلکہ ایک قول کے مطابق جو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے منسوب کیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کو چاہیئے کہ علم جہاں سے بھی ملے اسے حاصل کریں۔ گویا کہ وہ ان کی کھوئی ہوئی میراث ہے۔ صحیح سائنسی علوم کو مسترد کرنے کے طرزِ عمل کے خلاف امام غزالی کی تنبیہ جو ذیل میں نقل کی گئی ہے بہت سبق آموز ہے۔

انہوں نے سائنس کے ان نتائج میں جو دین سے متصادم ہیں اور جو نہیں ہیں تفریق کی ہے۔ ایسے نتائج کا تعلق جیسے زمین گول ہے یا نہیں اور سورج کے گرد گھومتی ہے یا نہیں۔ مؤخر الذکر قسم سے ہے۔ ان نتائج کے بارے میں وہ فرماتے ہیں۔

"چونکہ یہ چیزیں علوم ہیئت اور ریاضی کی رو سے ثابت ہو چکی ہیں اس لئے ان میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ کسی شخص سے جس نے ان چیزوں کا مطالعہ اس طرح کیا ہو کہ تمام متعلقہ مواد کی چھان بین کی ہو اور

اس بناء پر یہ بتا سکتا ہو کہ سورج گھن کب ہوگا؟ کامل
ہوگا یا جزوی اور کتنی دیر تک رہے گا؟ اگر آپ یہ کہیں
کہ یہ چیزیں دین کے منافی ہیں تو آپ کا یہ دعویٰ ان
چیزوں پر اس کے اعتقاد کو متزلزل کرنے کے بجائے
دین پر اس کے عقیدے کو متزلزل کر دے گا۔ ایک
بے اصول حامئی دین سے دین کو جتنا نقصان پہنچتا ہے
اتنا ایسے شخص سے نہیں پہنچتا جس کا عمل خواہ کتنا
ہی معاندانہ ہو مگر باضابطہ ہو۔ ایک مشہور ضرب
المثل ہے کہ۔

دانا دشمن نادان دوست سے بہتر ہوتا ہے۔"[1]

اپنے اس بیان کی تائید میں وہ ایک حدیث کے ایک جزو کا
حوالہ دیتے ہیں جس کا مفہوم یہ ہے کہ سورج گھن "سجدہ کرنے کا عمل"
ہے اس جزو کی مذمت کرتے ہوئے وہ اسے اس بناء پر من گھڑت قرار
دیتے ہیں کہ یہ ریاضیاتی اور ہیئتی ثبوت کے منافی ہے۔ استدلال کے
طور پر یہ فرض کرتے ہوئے کہ حدیث کے اس جزو کی عدم صحت کو
تاریخی اعتبار سے ثابت نہیں کیا جا سکتا وہ مندرجۂ ذیل متبادل چارۂ
کار تجویز فرماتے ہیں:۔

---

[1] الغزالی۔ تہافۃ الفلاسفہ (اردو ترجمہ از صبیح احمد کمالی) پاکستان فلاسوفیکل کانگریس
لاہور۔ ۱۹۵۸ء صفحہ ۶

"اس ثبوت کو (جو علوم ریاضی اور ہیئت سے حاصل ہوا ہے) جو فیصلہ کن اور قطعی ہے مسترد کرنے کے بجائے کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ اس کی تاویل کر لی جائے؟ لوگوں نے عقلی دلائل کی بہت سی سیدھی سادی عبارتوں کی تاویلیں کی ہیں حالانکہ وہ کبھی بھی اتنی واضح اور مدلل نہیں تھیں (جتنا کہ علوم ہیئت و ریاضی کے دلائل سے یہ معاملہ واضح ہو گیا ہے)[1]۔"

ان کا ارشاد ہے کہ دینی عقائد اور مسلم الثبوت نتائج میں تضاد سے دین کو نقصان پہنچتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ:-

"اگر دین کے حامی وثوق کے ساتھ یہ بات کہیں کہ اس قسم کی چیزیں دین کے منافی ہیں تو کافروں کو بڑی خوشی ہو گی۔ ان کے لئے ایسے دین کی تردید آسان ہو جائے گی جس کا عدم اور وجود سائنس کی مخالفت پر منحصر ہو گیا ہو[2]۔"

انہوں نے واضح کیا ہے کہ اس قسم کے تحقیقی نتائج دین کے

---

[1] الغزالی۔ تہافۃ الفلاسفہ (اردو ترجمہ از صبیح احمد کمالی) پاکستان فلاسوفیکل کانگریس لاہور ۱۹۵۶ء صفحہ ۷

[2] الغزالی۔ تہافۃ الفلاسفہ (اردو ترجمہ از صبیح احمد کمالی) پاکستان فلاسوفیکل کانگریس لاہور ۱۹۵۶ء صفحہ ۷

روحِ رواں نہیں ہیں۔

"کیونکہ بنیادی مسئلہ جو اس کے (یعنی ایک مسلمان کے) اور فلسفیوں (یا مادہ پرستوں) کے درمیان مابہ النزاع ہے وہ محض یہ ہے کہ آیا دنیا ازلی ہے یا اس کا وجود کسی زمانہ میں ہوا ہے۔ ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ دنیا اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہے خواہ یہ تخلیق کسی بھی طریقہ سے کی گئی ہو[1]۔

مندرجۂ بالا قول سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام صاحب کتنے تیز طبع تھے اور کتنی آسانی وصحت کے ساتھ مسائل کی تہہ کو پہنچ جاتے تھے۔ ان کی فکر، فکرِ جدید کا ایک نمونہ ہے جو صحیح سائنسی علوم کے نظریات کو تبدیل کرنے کے بجائے قطعی اور مسلم الثبوت تحقیقی نتائج کی روشنی میں تمام تنازعات کا فیصلہ کر سکتی ہے۔ سائنس کے بہت سے نظریات میں تلون ہے۔ امام صاحب کا قول ان کے متعلق نہیں ہے لیکن وہ بھی آیاتِ الٰہیہ کا موعودہ انکشاف ہونے تک تدریجی اقدام کے نصب العین کی تکمیل کا کام انجام دے سکتے ہیں۔ اس اثناء میں انہیں کارآمد آلات کی حیثیت سے استعمال کیا جاسکتا ہے اور ایسے نقوشِ قدم سمجھا جاسکتا ہے جن کے ذریعہ سے منزل تک افتاں وخیزاں

---

[1] الغزالی۔ تہافۃ الفلاسفہ (اردو ترجمہ از صبیح احمد کمالی) پاکستان فلاسوفیکل کانگریس لاہور ۱۹۵۸ء صفحہ ۷

رسائی ہو سکتی ہے۔

اس تشریح سے عیاں ہے کہ اسلام اور سائنس یا نفسِ سائنس میں کوئی تصادم نہیں ہے اس کے برعکس قرآن کریم میں بہت سا مواد ایسا ہے جو توسنِ فکر کو مہمیز کرتا اور انسانی ذہن کو استنباطی منطق کے طریقے پر کاربند ہونے کی تلقین کرتا ہے۔

۴

(اسلامی تاریخ کے تین مراحل)

اب اصل مسئلہ کو لیجئے کہ کیا مسلمانوں نے تخلیقی اور ذہنی سرگرمیوں کو ترک کرنے کی روش ذاتی تحفظ کے لئے مصلحتاً اختیار کی تھی۔ اس دعوے کی صحت یا عدم صحت کا تعین کرنے کا آسان ترین طریقہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ کا ایک طائرانہ جائزہ لیا جائے اور اس مقصد سے اسے تین مراحل میں تقسیم کیا جائے۔ پہلا مرحلہ مسلمہ طور پر ابتدائی اسلامی دور ہے جو اسلام کی قوتِ محرکہ کا مرحلہ ہے۔ دوسرا جمود کا مرحلہ ہے اور تیسرا اسلام کی ایسی قوتِ محرکہ کا مرحلہ ہے جیسی آج کل بیسویں صدی میں محسوس کی جارہی ہے اور نشاۃ ثانیہ کہلا رہی ہے۔

پہلا مرحلہ ــــ ناقابلِ انکار قوتِ محرکہ

مسلمانوں کی تاریخ کے پہلے مرحلے میں جو قوتِ محرکہ پائی جاتی ہے وہ کسی ثبوت کی محتاج نہیں ہے۔ وہ اسلام کا ایک معجزہ تھی۔ مغرب کو اس مرحلے میں عرصۂ دراز تک بربریت کے سوا کچھ اور نظر نہیں آیا اور وہ اسلام کو خوانخواری جذبہ کہتے رہے۔ لیکن جب سے مغرب کا تسلط دنیا پر قائم ہوا اور اس میں کمتری کا احساس جاتا رہا تو مغربی مفکرین اور مؤرخین اس امر کے بتدریج قائل ہو گئے کہ دینِ اسلام نے ایسی ثقافت پیدا کی جو اپنی ابتدائی چند صدیوں تک قوتِ محرکہ کے اعتبار سے حیرت انگیز تھی۔ اس معاملہ میں ان میں آپس میں اختلاف ہے تو صرف درجۂ حیرت کا ہے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ کیجیے کہ فلپ کے ہٹی (PHILIP K. HITTI) قوت کی کیفیت سے کس حد تک متاثر ہوا تھا۔ وہ اپنی تصنیف "عربوں کی تاریخ" میں لکھتا ہے۔

"اگر ساتویں صدی عیسوی کی پہلی تہائی میں کوئی شخص یہ پیشین گوئی کرنے کی جسارت کرتا کہ دس برس یا تقریباً اتنی ہی مدت کے اندر اندر عرب جیسی سرزمین سے جو اس وقت غیر معروف اور غیر متمدن تھی ایک ایسی غیر متوقع اور ناقابلِ یقین طاقت کا ظہور ہونے والا

ہے جو اس زمانے کی دو عالمی طاقتوں سے برسرِ پیکار ہو گی اور پھر ان میں سے ایک (ساسانی) کی کلی جانشین بن جائے گی اور دوسری (بازنطینی) سے اس کے بہترین علاقے چھین لے گی تو بلا شبہ اسے پاگل قرار دیا جاتا۔ لیکن واقعات نے اس کو سچ ثابت کر دکھایا[1]۔"

مرحلۂ اوّل کی مدّت

اس محرک دور کی حقیقت کی بابت تو نہیں لیکن اس کی مدت کے بارے میں اختلاف رائے ہے۔ خود اس دور کی ابتدا تو واضح ہے لیکن اس کے اختتام کی ابتدا واضح نہیں ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ مسلمانوں کا عروج تو شاندار اور باقاعدہ ہونے کی وجہ سے روزِ روشن کی طرح نمایاں ہے لیکن ان کے زوال کی ابتدا واضح نہیں ہے کیونکہ یہ نہ تو کبھی ساری دنیائے اسلام میں یکساں طور سے ہوا اور نہ اٹھارویں، انیسویں صدیوں کے سوا مکمل طور سے۔ چنانچہ اس امر کا تعین کہ جمود کا آغاز کب سے ہوا۔ تاریخ کے اس مرحلے کا ایک مابہ النزاع مسئلہ بن گیا ہے جب اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے ہم مسلمانوں

---

[1] فلپ کے ہٹی۔ دی عربس۔ اے شارٹ ہسٹری (عربوں کی مختصر تاریخ) میکملن اینڈ کمپنی لمیٹڈ۔ لندن ۱۹۶۸ء اشاعت چہارم صفحہ ۴۲

کی تاریخ اور ثقافت پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں اوسوالڈ اسپنگلر (OSWALD SPENGLER) اور کے ایل کروئیبر (K.L.KROEBER) جیسے ماہرینِ خصوصی کے خیالات کا علم ہوتا ہے۔ ان دونوں کے خیالات کا ذکر "مخالف خیالات" کے زیرِ عنوان پہلے کیا جا چکا ہے۔ اور ان کے اختلاف کے وجوہ بھی بیان کئے جا چکے ہیں۔ تیسرا نقطۂ نظر عام مؤرخین کا ہے۔

ان مؤرخین نے بہت کچھ لکھا ہے۔ انہوں نے حکمران خاندانوں اور سلطنتوں کے پرکھنے کا معیار ان کے سیاسی اقتدار کی مضبوطی یا کمزوری کو بنایا ہے۔ مسلمانوں کا کوئی حکمران خاندان یا ان کی کوئی سلطنت مسلمانوں کی تاریخ کے پورے چودہ سو سال تک برسرِ اقتدار نہیں رہی۔ یہی وجہ ہے کہ مؤرخین ہر حکمران خاندان یا سلطنت کو علیحدہ علیحدہ وحدت سمجھتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ انہیں فرقے۔ نسل یا علاقے کی بنا پر مجتمع کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر انہوں نے اندلس۔ مصر اور ہند کے مسلمانوں کی تاریخ یا عربوں۔ تاتاریوں۔ ترکوں اور مغلوں کی تاریخ لکھی ہے۔ بعض اوقات ہمیں ایسی تحریریں بھی ملتی ہیں جن کی ایک مثال ذیل میں پیش کی گئی ہے جس میں آرنلڈ جے ٹوائن بی (ARNOLD J. TOYNBEE) جیسے انصاف پسند اور قابل مؤرخ نے اسلامی تہذیب اور نسلی تہذیب کو باہم ملا دیا ہے۔

"عربوں کے معاملے میں ابھی تک یہ یقین سے نہیں کہا
جا سکتا کہ ترکیت اور مغربیت اختیار کرنے سے جو
پے در پے دھچکے صدیوں تک ان کو لگے ہیں انہوں
نے عربوں کو اپنے طرز کی زندگی گذارنے سے محروم کرکے
ان کو اجتماعی خودکشی سے بچا لیا ہے یا نہیں"[1]

یہ قول ان کی کتاب کے متن سے مناسبت رکھتا ہے لیکن اس کے پڑھنے والے کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ مصنف کے پیشِ نظر آیا اسلامی تہذیب ہے یا اس کے نسلی اجزاء۔ نیز آیا اس کی کل تہذیب کا مغربی تہذیب سے موازنہ کیا جا رہا ہے یا اس کے جزو کا۔ اپنی محولہ کتاب میں نیں تو انہوں نے اسلامی تہذیب کو کلی حیثیت سے تسلیم کیا ہے۔ لیکن مندرجہ بالا جملے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا انہوں نے اسلامی تہذیب کے دریا کو عربی اور ترکی جیسی کئی ندیوں میں بانٹ دیا ہے پھر انہیں ایک دوسرے سے الگ الگ سمجھتے ہوئے اُن کے ایک دوسرے سے مخلوط ہو جانے کی صورت میں ان کی بقا کا سوال اُٹھایا ہے۔ حالانکہ یہ ندیاں تو ایک ہی دریا کی ہیں۔ اگر ان ندیوں کے کنارے ٹوٹ جائیں اور ان کا پانی مل کر بہنے لگے تو ان کے خشک ہو جانے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ بشرطیکہ انہیں اپنے سرچشمہ سے برابر رسد ملتی

---

[1] اے جے ٹوائن بی۔ اے اسٹڈی آف ہسٹری (تاریخ پر ایک نظر) آکسفورڈ یونیورسٹی پریس لندن ۱۹۵۱ء جلد چہارم صفحہ ۱۰۵

رہے۔ وہ اسلامی روحِ تہذیب ہوتی ہے۔

اسلامی ثقافت یا تہذیب کی روح معلوم کرنے کے لئے مسلمانوں کو علاقائی یا نسلیں وحدتوں میں تقسیم کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کہ سُنّیوں۔ شیعوں اور وہابیوں کی سیاسی تاریخ کا الگ الگ لکھنا اس طرح قبل اس کے کہ روح تہذیب کی نشاندہی ہو سکے یہ روح ان رخنوں سے نکل جاتی ہے جو مؤرخین کی اس تقسیم سے ثقافت یا تہذیب میں پڑجاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سیاسی اقتدار کے مؤرخین مسلمانانِ عالم میں جمود کی ابتدار کا صحیح تعین کرنے یا اس پر متفق ہونے سے قاصر ہیں۔ ان مؤرخین کا خیال ہے کہ وہ طاقتیں جن کا مرکز عرب تھا علاقائی لحاظ سے ۷۴۳ء تک اپنی انتہار کو پہنچ گئی تھیں اور وہ طاقتیں جن کا مرکز اندلس تھا ۷۳۲ء ہی میں اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھیں۔ لیکن ایران کے صفوی خاندان۔ ہند کے متعدد حکمران خاندانوں اور عثمانی ترکوں کی طاقت کے بارے میں جن کی سلطنت سترھویں صدی عیسوی میں تین براعظموں میں دور دراز تک پھیل گئی تھی ان کا کیا خیال ہے؟ مسلمانوں کے زوال کے زمانے کا تعین ان مؤرخین نے جن وجوہ سے کیا ہے انہیں وجوہ کی بنار پر اسلامی ثقافت یا تہذیب کی طاقت کی مجموعی داستان سے ان کی علاقائی اور نسلی تاریخ کی کوئی مناسبت نہیں ہے۔

ان مؤرخین کی ایک اور کمزوری یہ ہے کہ وہ پہلے اقتدار کی

کیفیت اور وسعت پر نظر ڈالتے ہیں اور پھر اس کے اسباب تلاش کرتے ہیں۔ اس طرزِ تحقیق کی بناء پر شہرت بھی حاصل ہوتی ہے۔ اور بدنامی بھی۔ شہرت تو اس لئے حاصل ہوتی ہے کہ کسی تاریخی واقعہ کے اسباب کو اس واقعہ کے پیش آنے کے بعد دریافت کرنا اسباب کو قابلِ اعتبار بنا دیتا ہے کیونکہ صرف وہی اسباب درج کئے جاتے ہیں جو واقعہ کی نوعیت سے مطابقت رکھتے ہوں۔ علاوہ ازیں عروج وزوال کے تصورات کے عام عناصر بھی اس کو معتبر بنانے میں مدد دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر کسی سیاسی اقتدار کے زوال سے یہی تصور قائم ہوتا ہے کہ اس میں انحطاط کی سب وہی باتیں پیدا ہو گئی ہوں گی جو عام طور سے زوال کا موجب ہوتی ہیں۔ اگر کوئی ریاست کمزور ہو جائے تو اس امر میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ اس کے داخلی حالات یا تو خراب ہو گئے تھے یا کسی بیرونی دباؤ کے باعث اس کے نظم ونسق میں خلل آگیا تھا۔ اگر ریاستوں کے کسی مجموعہ میں نظم ونسق یا حکومت کا انداز یکساں ہو جیسا کہ مسلم ریاستوں میں تھا تو ان کی کمزوری کے اسباب بھی لازماً یکساں ہوں گے۔ چنانچہ ان کے زوال کے اسباب لکھنا آسان ہے۔

مسلم ریاستوں میں طرزِ حکومت کم وبیش ایک ہی قسم کا تھا۔ ان میں سے زیادہ تر ریاستوں میں موروثی بادشاہت قائم تھی جو شہری ریاستوں کے معدوم ہو جانے کے بعد سے سترھویں صدی

عیسوی تک بنی نوع انسان کے لئے حکومت کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ شکل رہی ہے۔ بادشاہ اپنے کچھ مددگار چن لیتا تھا جنہیں وزیر کہا جاتا تھا۔ ان کے علاوہ کچھ مشیر بھی منتخب کرتا تھا۔ ریاست کے علاقے کو صوبوں میں بانٹ دیا جاتا تھا جن پر نیم مختار صوبیدار حکومت کرتے تھے۔ شاہی خاندانوں کے افراد کی ایک خاص حیثیت تھی۔ وہ ریاست پر ہمیشہ اس طرح نظر رکھتے تھے جیسے وہ ان کی ذاتی ملکیت ہو۔ یہی کیفیت مغرب کی تھی سترھویں صدی عیسوی تک مشرق و مغرب میں مجموعی طور سے طرزِ حکومت کے معاملے میں زیادہ اختلاف نہیں تھا۔ اس نظامِ حکومت میں چند بنیادی کمزوریاں تھیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ نظم و نسق کے استحکام اور اس کی کارکردگی کا انحصار سربراہ ریاست اور اس کے منتخب وزیروں اور مشیروں کے ذاتی اوصاف پر ہوتا تھا۔ دوسری کمزوری یہ تھی کہ موروثی سربراہِ ریاست میں خوبیوں یا خامیوں کا ہونا زیادہ تر ایک اتفاقی امر ہوتا تھا۔ چنانچہ زوال کے اسباب میں درباریوں کی باہمی رنجش جانشینی کے جھگڑے، وہ برائیاں جو دولت کے بے موقع جمع ہو جانے سے پیدا ہوتی ہیں اور وہ خرابیاں جو نظم و نسق کی کمزوری سے رونما ہوتی ہیں ان کے انحطاط کا سبب ہوئیں۔ مؤخر الذکر خرابیوں میں ایک قسم کی سیاسی ابتری بھی شامل ہے۔ جس کے بعد ریاست اکثر انتقامی کارروائی کرتی تھی اور اس کا ضمنی اثر یہ ہوتا تھا کہ طالع

آزماؤں کو مواقع مل جاتے تھے۔ ان تمام باتوں میں کوئی بات اسلامی یا غیر اسلامی نہ تھی۔ مسلمان ملکوں کا کوئی مؤرخ اگر ان باتوں کا ذکر کرتا ہے اور اسلامی ثقافت یا مذہب کے بارے میں کچھ نہیں بھی لکھتا ہے تب بھی اس کا بیان حقیقت کے مطابق ہونے کی بنا پر ہمیں متاثر کرتا ہے کہ یہ مسلمانوں کا تذکرہ ہے اور وہ ہمارے لئے قابلِ قبول ہوتا ہے۔

نظریاتی ریاستوں میں نظریات کی مختلف تعبیریں سیاسی کمزوری کا ایک سبب بن سکتی ہیں جیسا کہ پچھلے بیس پچیس سال میں اشتراکیت کے نظریہ کی تعبیروں سے عیاں ہے۔ لیکن کوئی ایسی تعبیر جو ایمان داری اور نیک نیتی سے کی جائے اور پورے معاشرہ کو فکر و عمل کی ترغیب دے وہ کمزوری کا موجب نہیں ہوتی۔ ان مختلف نظریاتی تعبیروں کے اثرات کا صحیح اندازہ لگانا ان لوگوں کے لئے جو تعبیریں کرتے ہیں ایک بہت مشکل کام ہے کیونکہ معاشرہ کے اندر ان کا جو ردِ عمل ہوتا ہے وہ بڑا گمراہ کُن ہوتا ہے۔ بمثال کے طور پر "وہابیت" سے مسلمان تقریباً سو سال پہلے بہت خوف زدہ تھے۔ اس کے برعکس برطانوی حکومت کو شیخ محمد ابن عبدالوہاب کی اس تحریک میں بڑی صلاحیتیں نظر آئی تھیں۔ چنانچہ برطانیہ نے ایسے اقدامات کئے تھے کہ سارا عالمِ اسلام وہابیت سے برگشتہ ہو گیا تھا آج سعودی عرب جو اسی وہابیت پر عمل پیرا ہے مسلمانوں کے لئے

تقویت کا موجب بنا ہوا ہے۔

اجتہاد اور جمود

نظریات ہی کا ایک رُخ اجتہاد ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اجتہادِ فکر و عمل کو مسلمانوں میں ہمیشہ شک و شبہ کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ اس طرزِ عمل کی معقول تاریخی وجوہ ہیں۔ مثلاً مسلمانوں کے دور آغاز کی پہلی صدی یعنی ساتویں صدی عیسوی پر نظر ڈالی جائے تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ "خوارج" جنہیں سنی اور شیعہ یکساں طور پر ناپسند کرتے ہیں۔ ابتداءً ایک جذبے سے سرشار، صداقت پرستوں کی ایک جماعت تھی۔ لیکن اُنہوں نے ایک اپنی مخالف راہ اختیار کی اور اس کو منوانے کے لئے مسلمانوں کی تمام جماعتوں اور فرقوں کے خلاف ہتھیار اُٹھائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بڑی حد تک ان کا نام و نشان صفحۂ ہستی سے مٹ گیا۔ نویں صدی میں معتزلہ فرقہ، جس کے پیرو شمعِ عقل کے پروانے تھے، وجود میں آیا۔ خلفائے عباسیہ کی سرپرستی کے باعث اُن کو اعزاز و افتخار حاصل ہوا۔ ان خلفائے فلسفۂ یونان کے مطالعہ کی حوصلہ افزائی کی تھی جس سے یہ عقل پسند بہت متاثر ہوئے تھے۔ ان کی عقلیت پسندی بڑی حد تک دائرہ اسلام کے اندر تھی۔ چنانچہ اُنہیں اندلس میں بھی قدم جمانے کا موقع ملا۔ لیکن اپنی لگن میں حدود سے تجاوز کرنے کے علاوہ اُنہوں نے مقتضیات

وقت سے بھی روگردانی کی۔ لہٰذا مسلم مفکرین کی اکثریت بجا طور پہ ان کے خلاف ہر جگہ معترض ہوئی۔ ان کے حد سے تجاوز کرنے کے باعث مسلمان عقلیت پسندی اور اجتہاد دونوں سے خوف زدہ ہو گئے۔

ان کی ناعاقبت اندیشانہ عقلیت دینائے اسلام کی آئندہ عقلی سرگرمیوں کے لئے بڑی نقصان رساں تھی کیونکہ رد عمل یہ ہوا کہ داخلیت اور تصوف کو بالواسطہ تقویت پہنچی۔ بظاہر ان کی شکست سے جس کے وہ فی الواقع مستحق تھے مسلمانوں میں ذہنی جمود کا آغاز ہوا۔

کسی قوم کا زوال جبتک کسی واضح تباہ کن واقعہ سے نہ ہو اس کے آغاز کی تاریخ کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اپنی حالیہ اور شہرۂ آفاق کتاب "بنی نوعِ انسان پر مسلمانوں کے عروج و زوال کے اثرات" میں لکھا ہے کہ کسی قوم کو اپنے زوال کے آغاز کے صحیح وقت کا علم اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا جتنا کہ کسی شخص کو اپنی نیند کے آجانے کے لمحہ کا ہوتا ہے۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا عقلیت پسندی کو ملتِ مسلمہ میں مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ اُمتِ مسلمہ کا سیاسی زوال تیرھویں صدی عیسوی سے قبل شروع نہیں ہوا۔ صلیبی جنگوں نے جو گیارھویں صدی کے آخر میں شروع ہوئیں مسلمانوں کا حوصلہ بلند کر دیا تھا۔

پہلی صلیبی جنگ ۱۰۹۶ء میں ہوئی اور نویں اور سب سے بڑی صلیبی جنگ ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ پر عثمانی ترکوں کے از سرِ نو قابض ہو جانے کے ساتھ ختم ہوئی۔ اس صدی کے تین چوتھائی حصّہ تک دنیائے اسلام کو بحیثیت مجموعی نفسیاتی اعتبار سے عظمت حاصل رہی۔

صلیبی جنگوں میں مشکلات اور ناکامیوں کے بغیر فتح حاصل نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے صلیبی جنگوں میں حصّہ لینے والے مسلمان اپنی کارگذاری پر نازاں نہیں ہونے پائے لیکن ان کے اس خیال کی توثیق ہو گئی کہ وہ یورپ سے تہذیب، شجاعت، شرافت اور طاقت میں افضل ہیں اس احساس برتری نے ان خطرات میں جو فلسفۂ یونان کے مطالعہ سے دین کے تحفظ میں لاحق ہوئے تھے غفلت کے ایک نئے باب کا اضافہ کر دیا۔ سید امیر علی نے اپنی کتاب "مسلمانوں کی مختصر تاریخ" (۱۸۹۸ء) کے دیباچہ میں عربوں کے زوال کا جو واحد سبب بیان کیا ہے اس کا اطلاق دورِ عروج کے پورے عالمِ اسلام پر ہوتا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ:-

"اگرچہ اس نے (یعنی عرب نسل نے) عرب ہونے اور ایک طاقتور دولتِ مشترکہ کا رکن ہونے کا اعلان کبھی نہیں کیا تاہم نسل اور مذہب پر نازاں ہونے کے باعث جس کا اسے مستحق سمجھا جا سکتا ہے ساری دنیا

کو اپنے مغرور و متکبر ہونے کا تاثر دیا۔ اس زمانے
میں سشوپن ہار (SCHOPENHAUER) جیسا کوئی
ناقد نہ تھا جو اس کا مذاق اُڑاتا[1]۔"

دنیائے اسلام کی مخالف طرف صلیبی جنگوں نے یورپ پر رسوائی و بدنامی کے گہرے زخم لگائے۔ نصرانیت اسلام کو ہمیشہ اپنا مدِ مقابل سمجھتی تھی لیکن اس طویل تصادم سے دونوں کو اپنی اپنی سیاسی اور ثقافتی قوت کا بخوبی اندازہ ہو گیا۔ براعظم یورپ کو کو معلوم ہو گیا کہ وہ تہذیب اور علم میں کتنا پیچھے ہے۔ اسے مسلمانوں کے اعلیٰ تر اوصاف حاصل کرنے کی ضرورت کا شدید احساس ہوا اور وہ عزم و ہمت کے ساتھ اس مقصد کو حاصل کرنے پر کمربستہ ہو گیا۔ یورپ نے کئی صدیوں تک بلکہ جب تک وہ عالم اسلام سے زیادہ طاقتور نہیں بن گیا اس حقیقت کا اعتراف نہیں کیا کہ اس کی وہ تحریکیں جنہیں نشاۃ ثانیہ۔ اصلاح اور جوابِ اصلاح کہا جاتا ہے مسلمانوں سے اس کے رابطہ کی بدولت شروع ہوئیں۔ انتقام کی آگ اس کے دل میں صدیوں تک سلگتی رہی۔ آج تک بھی وہ اس بات کو فراموش نہیں کر سکا ہے کہ اسلام ایک ایسی طاقت ہے جو اگر پھر کبھی ایک عالمی طاقت بن گیا تو مغرب کے لئے خطرہ کا موجب

---

[1] سید امیر علی۔ اے شارٹ ہسٹری آف دی سیراسنز۔ میکملن اینڈ کمپنی لمیٹڈ۔ لندن ۱۹۶۱ء صفحہ ۹

ہو جائے گا اندلس کی عیسائی ریاستیں آپس میں لڑتی جھگڑتی رہتی تھیں لیکن ۱۲۱۲ء میں وہ متحد ہو کر وہاں کی مسلمان حکومت کے خلاف صف آرا ہو گئی تھیں اور انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ بہیمانہ طرزِ عمل اختیار کیا تھا۔ ان کا یہ اتحاد اُس نفرت ہی کا ایک نتیجہ تھا جو صلیبی جنگوں کی شکست سے پیدا ہوئی تھی۔ سرزمینِ اندلس سے مسلمانوں کا اخراج اس سرزمین کے لئے بڑا نقصان رساں ثابت ہوا۔ لیکن متعصب عیسائی ریاستوں کی نظر میں اس نقصان کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ لین پول (LANE POOL) نے اپنی کتاب "اندلس میں مورس" (THE MOORS IN SPAIN) کے آخر میں مندرجہ ذیل عبارت لکھی جو مسلمانوں کی خدمت کو خراجِ تحسین پیش کرتی ہے اور اہلِ اندلس کی اسلام دشمنی پر ایک تبصرہ ہے۔

"انہوں نے یہ نہیں جانا کہ اپنی سونے کا انڈا دینے والی مرغی کو ہی مار ڈالا ہے۔ صدیوں تک اندلس تہذیب، علوم و فنون، علم و حکمت اور ہر طرح کی شائستہ روشن خیالی کا گہوارہ بنا رہا۔ یورپ کا کوئی اور ملک اس وقت تک مورس کی متمدن قلمرو کا ہمسر نہیں ہوا تھا۔ فرڈینڈ (FERDINAND) اور آئی زابیلا (ISABELLA) کے دورِ حکومت اور چارلس پنجم کی سلطنت میں وہ آب و تاب پائیداری اور امتیازی شان نہ تھی۔ عیسائیوں

نے مورس کو اندلس سے جلا وطن کر دیا اور مسیحی اندلس
چاند کی طرح مستعار روشنی سے چمکتا دمکتا معلوم ہوا
لیکن پھر اسے ایسا گھن لگا کہ آج تک تاریکی میں ڈوبا
رہا ہے[1]"

اسلامی ثقافت کی قوت کو صلیبی جنگیں ختم نہ کر سکیں لیکن تیرھویں صدی عیسوی میں ایک ایسی تباہی آئی جس نے اسے پارہ پارہ کر دیا وہ تباہی تاتاریوں کا حملہ تھی۔ مسلمان مؤرخین اسے بغداد کی تباہی کہتے ہیں۔ اس تباہی اور بربادی کی تاریخ ۱۳ فروری ۱۲۵۸ء ہے۔ بغداد خلیفہ کا مسکن۔ مسلمانوں کی سیاسی اقتدار کا مرکز اور اس زمانے میں مسلمانوں کی ثقافتی شان و شوکت کا عَلم بردار تھا۔ تاتاریوں نے سلسلۂ ہندوکش سے لے کر بحیرۂ احمر اور بحیرۂ روم تک کا وہ سارا علاقہ جس پر مسلمانوں کی حکومت تھی تاخت و تاراج کر دیا۔ طرفہ تماشا یہ ہے کہ وہ مسلمانوں یا اسلام کے دشمن نہ تھے۔ انہیں اسلام یا نصرانیت سے کوئی سروکار نہ تھا۔ انہوں نے اس علاقے میں جو کچھ کیا وہی وہ کوریا۔ چین اور روس میں کر چکے تھے۔ ان کا مقصد محض وحشیانہ طاقت اور دولت کا حصول تھا۔ وہ جب خونخوار اور تربیت یافتہ جوانوں کے ڈھائی لاکھ لشکر کے ساتھ ٹوٹ پڑتے تھے تو دنیا کا کوئی ملک اس کی تاب نہ لا سکتا تھا۔ لیکن ۱۳۰۸ء میں انہوں

---

[1] اسٹینلے لین پول۔ دی مورز ان اسپین۔ یونائیٹڈ پبلشرز لاہور ۱۹۵۳ء صفحہ ۱۸۵

نے جب مصر پر حملہ کیا تو وہاں غلام خاندان کے ایک بادشاہ مظفر سیف الدین نے ان کے حملوں کو پہلی بار پسپا کیا۔ بعدازاں اسی خاندان کے بادشاہوں نے ۱۲۸۱ء میں اور ۱۳۰۰ء ۔ ۱۲۹۹ء میں ان کے حملوں کو پسپا کیا۔ ان فتوحات نے مصر کو تو بچا لیا لیکن ان کی بڑی قیمت ادا کرنی پڑی اور مسلمانوں کا وقار خاک میں مل کر رہ گیا۔ لاکھوں قتل ہوئے۔ ہزاروں علماء، سائنسدان اور مصنفین مارے گئے۔ کتب خانے۔ فن کے انمول ذخیرے اور عمارات جو حسن و زیبائش کا نمونہ تھیں تباہ ہو گئیں عالمِ اسلام کے حوصلے بالکل پست ہو گئے۔ تاتاریوں کا اپنا کوئی معقول دین نہ تھا۔ اسلام نے ان کے دل و دماغ کو مسخر کر لیا اور مسلم علاقوں کے تاتاری حکمرانوں نے اپنی فتح کے پچاس سال کے اندر اندر اسلام قبول کر لیا لیکن مسلمانوں کی تہذیب کو جو شدید نقصان پہنچا اور مسلمانوں کی جو بے عزتی ہوئی وہ عالمِ اسلام کے لئے ناقابلِ برداشت ثابت ہوئی۔

چنانچہ سب مؤرخین بالخصوص مسلمان مؤرخین ۱۲۵۸ء کو وہ سال سمجھتے ہیں جس سے مسلمانوں کے انحطاط کی واضح طور پر ابتدا ہوئی۔

مرحلۂ دوم

اس دور کا خلاصہ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا گیارہویں صدی عیسوی میں چونکہ دین کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا ہونے کی رو چلی تھی۔ اس لئے مسلمانوں نے تخلیقی ذہنی سرگرمیوں کو ترک کر دیا تھا۔ گیارہویں اور بارہویں صدی میں صلیبی جنگوں سے حاصل ہونے والی فتوحات سے مسلمانوں میں کچھ طمانیت پیدا ہوئی لیکن تیرھویں صدی کے وسط میں بغداد کی تباہی کے بعد ان کی شان و شوکت کا خاتمہ ہو گیا۔ اور دین کے سوا کوئی بھی قابلِ افتخار سرمایہ ان کے پاس نہ رہا۔ اب دین اور ایمان ہی کو ہر طرح کے حملوں سے محفوظ رکھنا لازم تھا۔ اس لئے دینی افکار کے حدود کو ممنوعہ علاقہ قرار دیدیا گیا اور تعمیر سلطنت، فنی کاموں۔ تعمیرات اور ادبی خدمات کو کار آمد دنیوی مشاغل سمجھ کر آزاد چھوڑ دیا گیا۔ ممتاز علمائے دین نے دینی خصوصیات کو اُجاگر کرنے اور تخلیقی ذہنی سرگرمیوں کو خطرناک قرار دینے اور ان کا انسداد کرنے پر توجہ مرکوز کی۔ اس کوشش میں نجی ذرائع سے دین کی تبلیغ و اشاعت کا کام بھی شامل تھا۔ اس رجحان نے جدت پسندی کی مخالف تمام قوتوں کو فعال بنا دیا اور ان کی حمایت میں شد و مد کے ساتھ دلائل پیش کئے جانے لگے۔

خاموش مفاہمت

یہ بات کہ مسلمانوں میں جمود پیدا ہوگیا تھا کسی ثبوت کی محتاج نہیں کیونکہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ اس کو غیر مسلموں سے زیادہ خود مسلمان تسلیم کرتے ہیں۔ ہم یہاں اپنے دعوے کو یاددہانی کے طور پر دوہرانا چاہیں گے کہ ذہنی سرگرمیاں ایک خاموش لیکن عمداً اختیار کی ہوئی پالیسی کے ذریعہ ترک کر دی گئی تھیں۔ یہ دعویٰ تو ہے مگر سوال یہ ہے کہ اس دعوے کو کس طرح ثابت کیا جا سکتا ہے؟

ثبوت کا مسئلہ

جدت ترک کرنے کی پالیسی چونکہ ایک خاموش مفاہمت کی بناء پر اختیار کی گئی تھی لہٰذا اس کے ثبوت میں کوئی دستاویز یا کسی بین الاقوامی ادارے کی قرار داد پیش نہیں کی جا سکتی مسلمانوں کا کوئی بین الاقوامی اجتماع مکے میں زائرین کے سالانہ اجتماع کے سوا موجود نہیں تھا تبادلۂ خیال نجی ملاقاتوں میں اور درویش صفت علماء کی ایسی تقاریر کے ذریعہ ہوا کرتا تھا جو وہ اپنے عقیدت مندوں کے مجمع میں کیا کرتے تھے۔ کوئی ایسا ریکارڈ بھی موجود نہیں ہے جس سے یہ ظاہر ہو سکے کہ مکے کے اجتماعات میں اس پالیسی کے بارے میں اتفاق رائے ہوا تھا جو مسلمانوں نے اختیار کی تھی۔ تاہم اس بات کا کافی ثبوت ملتا ہے کہ ممتاز علماء اور درویش اسلام کے بارے میں مکے سے درسِ بصیرت حاصل کرتے تھے۔ دین کا تحفظ اور جذبۂ اسلامی کا ازسرِ نو

بیدار کرنا چونکہ مخلص مسلمانوں کا مرغوب ترین موضوعِ بحث ہمیشہ رہا ہے۔ اس لئے ایک ایسے معاملہ میں جو علاقائی اور فرقہ وارانہ مفاد سے بالاتر تھا ہنگامی اتفاق رائے کے امکانات کو واضح کرتا ہے۔ اس سے بہر حال اتنا ہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس معاملے میں اتفاق رائے یا مفاہمت کے امکانات تھے۔

اگر ہم عالم اسلام کے ملکوں کے مختلف ادوار کے ممتاز مسلمانوں کی تحریروں پر نظر ڈالیں تو ہم قطعی ثبوت کے زیادہ سے زیادہ قریب آسکتے ہیں۔ لیکن میں سر دست اس کام کو سرانجام نہیں دے سکتا۔ یہ ایک کوتاہی ضرور ہے لیکن کوئی بڑا نقص نہیں کیونکہ تحریروں کا جمع کرنا بھی کوئی قطعی ثبوت نہیں ہے کیونکہ ایک وسیع دور اور نصف دنیا کے خطے سے متعلق مواد اخذ کرنے میں انتخاب و تعبیر کی جو ضرورت پڑتی ہے اس کا دارومدار مصنف کے میلانات اور زاویۂ نظر پر ہوتا ہے۔ یہ خود تاریخ نویسی کی ایک خامی ہے۔ علاوہ ازیں تفصیلات کے جمع کرنے میں پیچیدگیاں اور تضادات پیدا ہوتے ہیں جو واقعات کے اصل دھارے کی طاقت اور خصوصیات کو نظروں سے محو کر سکتے ہیں اور دھارے کے سرچشمے کو بھی روپوش کر سکتے ہیں۔ تفصیلات جاننے کی خواہش میں یہ جو خطرہ ہے اس کی اہمیت کو لوگ عام طور سے محسوس نہیں کرتے۔

بہترین صورت یہی معلوم ہوتی ہے کہ خود سرچشمے کی نوعیت

اور اس کی اصلی خصوصیات پر نظر رکھی جائے۔ کسی دریا سے نکلنے والی ندیوں کے پانی کے بہاؤ پر مقامی زمین کے نشیب و فراز کا اثر پڑتا ہے اور ان کا پانی مقامی زمین کے نمکیات سے بھی متاثر ہوتا ہے لیکن جب تک دریا خشک نہیں ہوتا اور اس سے ان ندیوں کو پانی ملتا رہتا ہے ان کے مقامی نمکیات کا ارتکاز کم ہوتا رہتا۔ اس لئے ہم فرقوں، ذیلی فرقوں اور مختلف مکاتیبِ فکر سے قطع نظر کرتے ہوئے ملت کے وسیع تناظر سے بحیثیت مجموعی بحث کریں گے۔

مسلمانوں میں جو خاموش مفاہمت ہوئی تھی اس کو کسی براہِ راست شہادت کے ذریعہ ثابت نہیں کیا جا سکتا لیکن جن حالات و واقعات سے اس کی تائید ہوتی ہے ان میں سے ایک تصوّف بھی ہے جو اس زمانے میں دنیا بھر میں دین کے تحفظ اور اس کی نشوو نما کے طور پر اختیار کیا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ سے براہِ راست تخاطب کی تمنا مسلمانوں میں ہمیشہ موجود رہی ہے۔ لیکن گیارہویں صدی یا تقریباً اسی دور میں تصوف کے مختلف مکاتیب کے قیام سے ذہنی سرگرمیوں کی مخالفت بہت نمایاں ہو گئی۔ عقلیت پسندی سے تنفر پوری ملّتِ اسلامیہ کا طرزِ فکر بن گیا۔ اس زمانہ کا دوسرا رجحان اجتہاد سے گریز تھا۔ علماء کی اندھی تقلید کی مخالفت تقریباً ختم ہو گئی تھی۔ اس دور کی تیسری خصوصیت ذہنی سرگرمیوں کا جزوی امتناع تھا۔ البتہ ایسی سرگرمیاں جن کا تعلق تعمیرِ سلطنت۔ فنونِ

لطیفہ۔ تعمیرات اور ادب سے بھا بدستور جاری رہیں۔ اسلامی ثقافت کی قوت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ ذہنی تخلیق اختراع اور ایجادات ترک کر دی گئی تھیں۔ لیکن ان سرگرمیوں کے ترک ہونے سے مسلمانانِ عالم کی سیاسی طاقت کو جو ایشیا اور افریقہ میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل گئی تھی پانچ سو سال تک کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ چنانچہ مسلمانوں کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ اجتہاد سے گریز کی پالیسی بجا و درست ہے۔ یہ اعتقاد اس دور کی ایک خصوصیت تھا۔ لیکن اس چوتھی خصوصیت کا ذکر مؤرخین نے عام طور سے نہیں کیا ہے۔

ان چاروں خصوصیات یا رجحانات کی موجودگی کا قابلِ اعتبار ثبوت پیش کرنا ضروری ہے ثبوت پیش کرنے کے کام میں جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے چند دشواریاں ہیں۔ اس کے علاوہ اختصار بھی پیشِ نظر ہے۔ ان حالات میں بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند نمایاں تاریخی واقعات بیان کر دیئے جائیں اور موضوعات زیرِ بحث سے متعلق چند قابلِ اعتماد تصانیف کا جو مجھے آسانی سے دستیاب ہو سکتی ہیں حوالہ دیدیا جائے۔ ان حوالہ جات کا نقل کر دینا زیادہ بہتر ہوگا تاکہ پڑھنے والوں کو ان کی تلاش میں جو زحمت ہوتی ہے اس کی حاجت نہ رہے۔ اس طریقہ میں ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اقتباسات میں ان سیاسی اور مذہبی تحریکات کا ذکر اختصار کے ساتھ مل جاتا

ہے جو عالم اسلام کے بڑے بڑے علاقوں میں جاری وساری رہی ہیں۔ اس طریقۂ کار میں یہ خامی ضرور ہے کہ پیش کردہ اقتباسات کے انتخاب کا انحصار مصنف کے میلانِ طبع پر ہے۔ لیکن اس مقالے میں تاریخ کے ساتھ انصاف برتنے کی پوری پوری کوشش کی گئی ہے۔

ثبوت

(۱) تصوف

جو ثبوت پیش کئے جا سکتے ہیں ان میں پہلا درجہ تصوّف کو حاصل ہے۔ کیونکہ یہ علانیہ طور پر اسبابِ دنیا کے خلاف ہے۔ دوسرے الفاظ میں دنیاوی لحاظ سے اس میں جمود ہے۔ یہ جمود اسلام کے منافی ہے۔ اس کے اس پہلو کا احساس غیر مسلموں کو مسلمانوں سے زیادہ ہوا ہے۔ "ڈکشنری آف اسلام" میں تصوف کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

"دنیا کا تقریباً واحد مذہب (یعنی اسلام) جس کے بارے میں ہمیں بلاحجت یہ تسلیم کر لینا چاہیئے تھا کہ اس میں ہندوانہ وحدت الوجود اور (دنیا سے بے تعلق) عرفانِ حق کے تصور کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور یہی محمد صلے اللہ علیہ وسلم اور ان کے پیروؤں کا اٹل مسلک ہے۔ مگر مسلمانوں میں بھی ایسے لوگ ہمیشہ رہے ہیں جو

مذہب اور اس کے عقائد سے جزوی یا کلی طور پر
بے نیاز ہو کر انفرادی حیثیت سے وجدانِ حق کے
متلاشی ہوتے ہیں"۔[1]

تصوف کے اس شغف کو شریعت نے کبھی بھی مکمل طور سے قبول نہیں کیا چنانچہ شریعت اور طریقت دونوں نظام ہمیشہ ایک دوسرے کے متوازی چلتے رہے۔ علماء نے ہمیشہ عقائد کی مذمت کرنے کے رجحان پر اعتراض کیا لیکن عام طور پر وجدانی اور جذباتی صلاحیتوں سے کام لینے میں اتنی جاذبیت پائی گئی کہ اس نے عقلیت اور عقائد کے احترام دونوں پر عملاً قابو پالیا گیا۔ بہت سے مشہور ومعروف علماء خود صوفیا بن گئے اس لئے عام آدمی کے لئے تصوف اور شریعت میں تفریق بھی دشوار ہو گئی۔ تصوف کی مقبولیت اور شریعت کے ساتھ اس کی عدم مطابقت کو جے۔ اسپینسر ٹریمنگھم (J. SPENCER TRIMINGHAM) نے بخوبی واضح کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے :-

"ہم بتا چکے ہیں کہ تصوف کو اسلام کی پیغمبرانہ ساخت
سے مکمل طور پر کبھی بھی ہم آہنگ نہیں کیا جا سکا
لیکن اسے اس کے متوازی چلتے رہنے کی اجازت

---

[1] ٹی۔ پی ہیوز (T.P. HUGHES) اے ڈکشنری آف اسلام۔ پریمیر بک ہاؤس لاہور۔ ۱۹۶۴ء صفحہ ۴۲۶

دے دی گئی۔ جس ذریعہ سے صوفی مسلک کے مختلف
پہلوؤں کو عام آدمی کی ذہنیت اور ضرورت کے مطابق
بنایا گیا وہ صوفی منش درویشوں کے سلسلے تھے[1]۔"

اس میں شک نہیں کہ قرآن پاک نے اللہ تعالیٰ کا جو تصور دیا
ہے اس میں تصوف کے افکار کا شائبہ نظر آتا ہے۔ وہ دونوں آیات
جن کا حوالہ پہلے دیا گیا ہے۔ سورت نمبر ۲ آیت نمبر ۲۲۵ اور سورت
نمبر ۲۴ آیت نمبر ۳۵ تصوف کا سرچشمہ ہیں۔ لیکن تقریباً سب صوفیا
جن کا طرزِ عمل فرقہ واریت سے یقیناً بالاتر تھا اس بات پر بھی فخر
کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ
کے مابین روحانی رشتے کا ورثہ انہیں حاصل ہوا ہے۔ وہ
متفقہ طور پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اپنے مسلک کا بانی سمجھتے ہیں
لیکن جیسا کہ آر۔ اے۔ نکلسن[2] (R. A. NICHOLSON) اور شاہ
ولی اللہ[3] نے بتایا ہے دورِ اولیٰ کے صوفیا نے روحانی بلندی حاصل
کرنے کے لئے جسمانی اور ذہنی ریاضتیں نہیں کیں۔ وہ بس اچھے

---

[1] جے۔ اسپینسر ٹرمنگھم۔ دی صوفی آرڈرز ان اسلام (اسلام میں صوفیا کے سلسلے)
آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔ آکسفورڈ ۱۹۷۱ء صفحہ ۱۴۳

[2] آر۔ اے نکلسن۔ دی مسٹکس آف اسلام (اسلام کے صوفیا) راؤٹ لیج اینڈ کیگن پال
لندن ۱۹۶۲ء صفحہ ۱۵

[3] شاہ ولی اللہ۔ ہمعات۔ بیت الحکمت لاہور ۱۹۴۴ء باب ۲

اور راسخ العقیدہ مسلمان تھے جو صرف اپنے دینی فرائض کی بجاآوری سے روحانی تسکین حاصل کرتے تھے سجادہ و دلق کے رہین منت نہیں تھے۔ ان کے نزدیک شہری، اخلاقی اور روحانی فرائض میں کوئی فرق نہ تھا۔ تمام فرائض کی انجام دہی اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کی عقیدت کا براہ راست نتیجہ تھی اور ان ہی کی تکمیل روحانی تسکین کا موجب ہوتی تھی۔ فرائض میں تفریق اس وجہ سے نہ تھی کہ وحدانیت کا تصور قوی تھا اور اسی کی وجہ سے ساری کائنات اور اس کے سارے لوازم ایک ہی اکائی کے اجزا تھے اس کے برعکس آج کل شہری، اخلاقی اور روحانی فرائض میں تفریق کی جاتی ہے۔ مغرب کے اثر کی وجہ سے شہری فرائض دینی فرائض سے الگ گنے جاتے ہیں۔ چنانچہ مغرب کی لادینیت کا مسلمانوں پر ایک اثر یہ بھی ہوا ہے کہ ان میں شہری ذمہ داریوں کا احساس کمزور پڑ گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لادینیت نے اس کائناتی شعور کو جو شریعت کی پابندی کے باعث ان میں پیدا ہوا تھا کمزور کر دیا ہے مگر مغرب کا اثر چونکہ زیادہ گہرا نہیں ہے اس لئے وہ بالکل مغرب ہی کے ہو کر نہیں رہ گئے ہیں اور اس حد تک گمراہ نہیں ہوئے ہیں کہ شہری فرائض کو محض معاشرتی زندگی کا لوازمہ سمجھنے لگیں۔ نہ مغرب کا اثر پورا ہے اور نہ وحدانیت کا احساس قوی ہے۔

شاہ ولی اللہؒ کے خیال کے مطابق تصوف کی تاریخ کو چار

ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے پہلا دور جس کا ذکر پچھلے پیرے میں کیا گیا ہے۔ نویں یا دسویں صدی میں حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ (وصال ۹۱۵ء) کے منظر عام پر آنے کے بعد ختم ہوا۔ تصوف کی مقبولیت اور ترقی کا دوسرا اور تیسرا دور حضرت محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ (۵۶۰ تا ۶۳۸ھ) ۱۱۶۴ء تا ۱۲۴۰ء کے عروج کے ساتھ ساتھ اختتام کو پہنچا۔

اس وقت تک روحانی مشقیں اپنی تجلیات اور وجدانی کیفیات کے ادّعا کے باوجود عوام کے لئے جاذب توجہ نہیں بنی تھیں۔ تصوف کو مقبولیت اس وقت حاصل ہوتی ہے جب عوام پریشانی اور تشویش میں مبتلا ہوں کیونکہ یہ مصائبِ دوران کو برداشت کرنے کے عقیدے کو تقویت پہنچاتا ہے یہ نہ صرف روحانی اتحاد پیدا کرتا ہے اور صوفیا اور ان کے ہم خیال لوگوں کو دنیوی ترغیبات اور مایوسیوں سے بچاتا ہے بلکہ عقائد کی سخت پابندی میں نرمی پیدا کر کے فرض کی گراں باری کو ہلکا کرتا ہے۔ نویں اور دسویں صدیوں کے دورِ تشکیک اور تیرھویں صدی کے زوال پذیر انقلاب کے بعد یہ مسلمانوں کے دکھ درد کا بہترین مداوا بن گیا تھا۔ چنانچہ اس مسلک کے تمام عظیم مکاتیبِ فکر یعنی حضرت عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ (وصال ۱۱۶۶ء) کا سلسلۂ قادریہ۔ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ (وصال ۱۱۶۸ء) کا سلسلۂ سہروردیہ۔ حضرت احمد ابن الرفیع

رحمۃ اللہ علیہ (وصال ۱۱۸۳ء) کا سلسلۂ رفاعیہ۔ حضرت ابومدائنہ شعیب رحمۃ اللہ علیہ (وصال ۱۱۹۷ء) کا سلسلۂ رفاعیہ سرہیلیہ۔ حضرت شیخ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ (وصال ۱۲۳۶ء) کا سلسلۂ چشتیہ۔ حضرت جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ (وصال ۱۲۷۳ء) کا سلسلہ مولاویہ حضرت بہاؤ الدین نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ (وصال ۱۳۷۹ء) کا سلسلہ نقشبندیہ۔ گیارہویں صدی عیسوی سے لے کر چودھویں صدی عیسوی تک معرض وجود میں آئے یہ سارا دور اس زمانے کے ساتھ توارد رکھتا ہے جس میں تشکیک کی وبا پھیل گئی تھی اور تاتاری حملہ تباہی کا موجب بن گیا تھا۔ اس مسلک کا اچھا اثر یہ ہوا کہ ایک طرف اسلام عقلیت پسندی۔ تجربیت اور عملیت کے شکوک پیدا کرنے والے حملوں سے محفوظ رہا اور دوسری طرف جیساکہ اوپر بیان کیا گیا ہے دنیوی سرگرمیوں کے راستے مسلمانوں کے لئے کھلے رہے۔

۲ اجتہاد کی ممانعت

تصوف کے بعد اجتہاد کی ممانعت کا نمبر آتا ہے۔ اجتہاد کو تقلید یا شریعت کے مسلمہ شارحین کے مقرر کردہ اصولِ اطوار اور عقائد کی اندھی پیروی نے اپنا ہدف بنایا۔ اس کا سبب جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے تشکیک کا دور اور تاتاریوں کے ہاتھوں شکست کا واقعہ تھا۔ ڈاکٹر محمد اقبالؒ نے اس طرزِ فکر کا تجزیہ کیا ہے جس نے اسلام کو عملاً غیر محرک بنا دیا تھا۔ انہوں نے جمود کے تین اسباب

بتائے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ۔

(۱) "ہم سب اس تحریک سے جو مذہبِ اسلام سے متعلق دورِ عباسیہ کے اوائل میں عقل کی برتری کے حق میں رونما ہوئی واقف ہیں اور ان تلخ مباحث سے بھی واقف ہیں جو اس تحریک کے باعث رونما ہوئے.... چنانچہ کچھ تو عقلیت پسندی کے مقاصد کے بارے میں غلط فہمی کی بناء پر اور کچھ عقلیت پسندوں کی حد سے تجاوز کرنے کے سبب راسخ العقیدہ مفکرین اس تحریک کو ایک تباہ کن طاقت سمجھنے پر مجبور ہو گئے۔ انہوں نے اسے اسلام کی معاشرتی زندگی کے لئے ایک خطرہ قرار دیا۔ انہیں اسلام کی معاشرتی یک جہتی کے تحفظ کی فکر لاحق تھی اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ان کے پاس شریعت کی شیرازہ بند قوت کے استعمال اور اپنے فقہی نظام کو سخت سے سخت تر بنانے کے سوا چارۂ کار نہ تھا"[1]

علامہ اقبال کے نزدیک مکاتیب فقہ کی سختی کے ساتھ ان کی تنظیم بھی اسی تشویش کا نتیجہ تھی۔ اس سختی نے اجتہاد کا گلا گھونٹ

---

[1] ڈاکٹر محمد اقبال۔ دی۔ ری کنسٹرکشن آف ریلیجس تھاٹ ان اسلام (اسلام میں فکرِ اسلامی کی ازسرِ نو تعمیر) شیخ محمد اشرف لاہور ۱۹۷۵ء صفحہ ۱۴۹

دیا۔ اس کے علاوہ۔

(۲) "اس راہبانہ تصوف کی ابتدا اور نشو و نما جو غیر اسلامی نوعیت بلکہ خالصتاً قیاسی نوعیت کے اثرات کے تحت پروان چڑھا۔ اجتہاد کی مخالفت کی بڑی حد تک ذمہ دار ہے۔"[1]

وہ یہاں تصوف کی ابتدا کے اسباب سے بحث نہیں کرتے بلکہ صرف اجتہاد کی ممانعت سے بحث کرتے ہیں۔ اس ممانعت سے بحث کرتے ہیں اس ممانعت میں سختی اس لئے پیدا ہوئی کہ۔

(۳) "تیرھویں صدی عیسوی کے وسط میں بغداد کی تباہی کا انتہائی سنگین واقعہ پیش آیا۔ بغداد مسلمانوں کی ذہنی کاوشوں کا مرکز تھا۔"[2]

اُنہوں نے اس امر کی بھی تشریح کی ہے کہ دین کے تحفظ کے بارے میں خدشات کس طرح جمود کی پالیسی کا موجب ہوئے۔ لکھتے ہیں کہ۔

"انتشار کے خوف سے جس کا پیدا ہونا سیاسی انحطاط

---

[1] ڈاکٹر محمد اقبال۔ دی۔ ری کنسٹرکشن آف ریلیجس تھاٹ ان اسلام (اسلام میں فکر اسلامی کی از سرِ نو تعمیر) شیخ محمد اشرف لاہور ۱۹۷۵ء صفحہ ۱۵۰

[2] ڈاکٹر محمد اقبال۔ دی۔ ری کنسٹرکشن آف ریلیجس تھاٹ ان اسلام (اسلام میں فکر اسلامی کی از سرِ نو تعمیر) شیخ محمد اشرف لاہور ۱۹۷۵ء صفحہ ۱۵۱

کے ایسے دور میں ایک فطری امر تھا۔ راسخ العقیدہ
مفکرین اسلام نے ابتدائی دور کے علماء کی پیش کردہ
شریعت میں اجتہاد کا سختی کے ساتھ تدارک کر کے
مسلمانوں کے لئے یکساں معاشرتی زندگی کا انتظام
کرنے پر اپنی تمام تر توجہ مرکوز کی ہے۔[1]

اجتہاد کا تدارک کس طرح کیا گیا

اجتہاد کی ممانعت اور تقلید کی تبلیغ کا کوئی جواز اصل دین میں موجود نہ تھا۔ اجتہاد کا اصول مسلم تھا۔ سنی شریعت کے مقابلہ میں شیعی شریعت میں اجتہاد زیادہ واضح طور پر مسلم تھا۔ لیکن مؤخر الذکر شریعت سے تعلق رکھنے والوں پر بھی مؤثر تحدید عملاً عائد تھی۔ اس تحدید کے حق میں جو دلائل پیش کئے جاتے تھے وہ تمام مکاتیبِ فکر کے نزدیک معقول تھے۔ دو دلائل جو اجتہاد سے گریز کے حق میں اکثر دیئے جاتے رہے ہیں یہ ہیں کہ اول یہ کہ بہت کم علماء ایسے تھے جو علمیت اور بصیرت کے اعتبار سے اجتہاد کے مجاز ہوں یا زہد کے معیار پر پورے اترتے ہوں۔ اجتہاد کی اہلیت پر اس پابندی کے عائد کرنے کا بڑا گہرا اثر ہوا تھا۔ دوسری دلیل بہت مقبول ہوئی اس کے یہ دو اجزاء تھے۔

---

[1] ڈاکٹر محمد اقبال۔ دی۔ ری کنسٹرکشن آف ریلیجس تھاٹ ان اسلام (اسلام میں فکر اسلامی کی از سر نو تعمیر) شیخ محمد اشرف لاہور ۱۹۷۵ء صفحہ ۱۴۹

(۱) سرشتِ انسانی اور لوازماتِ زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی اس لئے پرانی نظیریں آئندہ رہنمائی کے لئے کافی ہیں، خصوصاً اس وجہ سے کہ۔

(۲) فکرِ اسلامی کے پرانے رہنماؤں نے ان سارے معاملات سے نمٹنے میں جو انہیں پیش آئے تمام ضروری امور کی وضاحت کردی ہے ان ضروری اُمور سے متعلق ان کے فتوے تلاش کرنا چاہیئے اور ان پر عمل کرنا چاہیئے۔ اس طرزِ فکر سے فخر و عقیدت کے ان جذبات کی تسکین ہوتی تھی جو مسلمانوں کے دلوں میں اپنے ماضی کے بارے میں موجزن تھے۔

اس زمانے میں یہ ایک عجیب منطق استعمال کی جاتی رہی ہے کہ وہ تمام عقلی دلائل جو قدامت پسندی کی موافقت میں ہوں صحیح ہیں، لیکن وہ دلائل جو تبدیلی کے حق میں ہوں سراسر غلط ہیں۔ درحقیقت یہ منطق نہیں تھی بلکہ اس کی بنیادی وجہ تحفظ دین کی پالیسی تھی۔

شاہ ولی اللہ (۱۷۰۲ء تا ۱۷۶۲ء) نے تقلید پر سخت اعتراض کیا ہے اور اسے نقصان رساں۔ غلط بلکہ بدعت اور بذاتِ خود ایک اجتہاد قرار دیا ہے لیکن وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ایسے حالات میں جیسے خود ان کے زمانے میں تھے تقلید کی پالیسی پر عمل کرنا عقلمندی ہے۔ وہ اپنی معرکۃ الآراء تصنیف میں لکھتے ہیں۔

"اس زمانے میں جب کوشش و محنت کرنے کے لئے ہماری صلاحیتیں پست ہو چکی ہیں، لوگ اپنی خواہشات کے بندے بن گئے ہیں اور ہر شخص خود اپنی رائے اور اپنے ذہن پر فخر کرتا ہے۔ ابن الہیثم (جس کے نزدیک اندھی تقلید گناہ ہے) کی تحریروں پر عمل ایک حد تک تشدّد کے مترادف ہوگا"[1]

مذکورہ بالا اقتباس میں اس امر کا واضح طور پر اعتراف کیا گیا ہے کہ تقلید کو وقتی طور سے مصلحتاً اختیار کرنا جائز ہے۔ یہ مصلحت فقط اعتقادات کے تحفظ کے لئے تھی۔ چنانچہ تصوّف اور تقلید میں سے کسی کا یہ مقصد نہ تھا کہ اختلافات در دین اور ذہنی مشاغل کے سوا دیگر مشاغل میں بھی تخلیقی سرگرمیاں ترک کر دی جائیں۔

تخلیقی سرگرمیوں کا دائرہ

(۱) فنون لطیفہ اور تعمیرات۔ اخلاقی اور ذہنی شعبوں کے سوا دیگر شعبوں میں عظیم مرتبت کا کام ہوا جس سے اسلام کی قوتِ محرکہ کا ثبوت ملتا ہے۔ ہم اس کام کا جائزہ لینے کی ابتدا فنون اور تعمیرات کے شعبے سے کریں گے۔ اس بارے میں مغربی مبصرین نے حال میں بہت مواد شائع کیا ہے۔ ہم ان کے

---

[1] شاہ ولی اللہ۔ حجت اللہ البالغہ (اردو ترجمہ از مولانا عبد الرحیم) قومی کتب خانہ لاہور جلد اول (آخری جزو کا باب پنجم)

ممنون ہیں کہ ان موضوعات پر ان کی اعلیٰ تصانیف نے دنیا کو معلومات بہم پہنچائیں۔ اُنہوں نے جو کچھ مواد شائع کیا ہے وہ مغرب اور مغرب سے متاثر مسلمانوں کے پسندیدہ انداز میں کیا ہے۔

مسلمانوں کے فن میں خطاطی۔ نقاشی۔ خوشنما قالین سازی، منقش عمارتی۔ سنگ سازی۔ اعلیٰ ترین صناعی کی دھات کاری اور کتابوں کے چرمی جزدانوں کی تیاری شامل تھی اور اِسے اُنہوں نے حسن وطرز کے لحاظ سے فن کا نادر نمونہ بنا دیا تھا۔ لیکن سب سے زیادہ فوقیت ان کے طرزِ تعمیر کو حاصل ہے جو "اسلام کی خصوصیات و نظریات کی مجسم یادگار ہے۔" مسلمانوں کی تعمیرات میں مساجد کو سب سے زیادہ فوقیت حاصل ہے۔ اس کے بعد مقبروں اور اس کے بعد محلات اور شہروں اور ان عمارتوں کا درجہ ہے جو تعلیم گاہوں کے طور پر استعمال ہونے کے لئے بنائی گئی تھیں۔

مسلمانوں کے فنون اور تعمیرات میں جدت یہ ہے کہ وہ اسلام کے روح کی ترجمانی کرتی ہیں۔ ٹیٹس بک ہارٹ (TITUS. BURKHARDT) اپنی کتاب "اسلام کا آرٹ" کی تمہید میں لکھتا ہے۔

"اگر کسی کو اس سوال کا جواب دینا ہو کہ اسلام کیا ہے؟ تو اس کے جواب میں اسلامی فن کے کسی شاہکار مثلاً قرطبہ کی مسجد یا قاہرہ کی ابن طولون کی مسجد یا سمرقند کے کسی مدرسے یا تاج محل کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہوگا

کیونکہ اسلامی فن اسم با مسمیٰ ہے۔ وہ اپنے نام کی تمام خصوصیات کا علم بردار اور واضح علمبردار ہے۔ مانا کہ اظہار کے طریقوں میں نسلی ماحول اور مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ تبدیلی ہوتی ہے اور ان دونوں میں میں نسلی ماحول کو زیادہ اہمیت حاصل ہے وہ جمالیاتی نقطۂ نظر سے اور اپنے روحانی مقاصد کے لحاظ سے مکمل ہوتے ہیں اور ان میں کوئی بے ربطی نہیں ہوتی۔"[1]

یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کا آرٹ جامد ہے۔ وہ اس اعتراض کا جواب یوں دیتا ہے۔

"نمونوں کے ساتھ اس وفاداری کی وجہ سے جس کا مذہب میں فی الحقیقت کوئی جواز نہیں ہے لیکن جو متقدین کی اتفاق رائے سے برگزیدہ ہو گئی ہے اسلامی آرٹ کو جمود کا موردِ الزام بنایا گیا ہے گویا وہ ثبات جو صدیوں تک اسلامی آرٹ کو حاصل رہا جمود یا عدم واقفیت کا نتیجہ تھا حالانکہ کسی مقدس آرٹ میں نہ تو ندرت ہوتی ہے اور نہ جمود۔ وہ اپنے اصولوں کی پابندی کی بنا پر فعال اور اصولی علم و آگہی کا ترجمان

---

[1] ٹیٹس بک ہارٹ۔ آرٹ آف اسلام (اسلامی فن) ورلڈ آف اسلام فیسٹیول پبلشنگ کمپنی لمیٹڈ۔ لندن صفحہ ۱

ہوتا ہے۔ وہ اگر اپنے اصولوں سے روگردانی کرے
تو اصولی طور پر زوال پذیر اور معدوم ہوتا ہے[1]"

مندرجۂ بالا اقتباس کے آخری فقرے قابلِ داد ہیں۔ ان سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ مغرب کو جوان معاملات میں تحقیق و جستجو سے کام نہیں لیتا بلکہ محض تبدیلی کا خواہاں رہتا ہے ان چیزوں میں جن کا تعلق اسلام سے ہے جمود کیوں نظر آتا ہے۔ بے مقصد جدت اور لامحدود تبدیلی کے فقدان کا سبب ذہنی استحکام میں تلاش کرنے کی ضرورت ہے کسی جہاز کا ہوا کے رحم و کرم پر ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ اس کے لنگر میں وزن نہیں ہے۔

اس مختصر مقالے میں تفصیلات میں جانے کی گنجائش نہیں ہے اسلئے ہم اس پہلو کو یہ کہہ کر ختم کرتے ہیں کہ اسلامی تصورات مسلمان معماروں کو اتنے عزیز تھے کہ انہوں نے اپنی تعمیرات کے ذریعہ سے بھی اللہ تعالیٰ کی لامحدودیت اور دوام اور کائنات کی محدودیت اور اس کے عدم استحکام کو ظاہر کیا ہے۔ ان باریکیوں کو امبر سیریٹو (UMBERTO SCERRATO) نے اپنی کتاب تہذیب کی رفتار اور اسلام (MOVEMENTS OF CIVILIZATION-ISLAM) میں واضح کیا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

---

[1] ٹیٹس بک ہارٹ۔ آرٹ آف اسلام (اسلامی آرٹ) ورلڈ آف اسلام اسلام پبلیکیشن کمپنی لمیٹڈ صفحات ۱۱۷ تا ۱۱۸

"اسلامی آرٹ میں ایک تجریدی اور گریزاں طرزِ اظہار اختیار کیا گیا۔ فطری شکلوں کو مروجہ رسم و رواج کے مطابق غیر حقیقی شکلوں میں پیش کیا گیا۔ آخرت کی ابدی زندگی کے مقابلہ میں دنیا کی عارضی زندگی اور جدت پذیری کے مقابلہ میں ازلی و ابدی حقیقت کا بار بار اور مسلسل طور سے اظہار کیا گیا ہے۔ اس طرزِ عمل کی عکاسی اس بات سے ہوتی ہے کہ عمارات میں اکثر کمزور اشیاء مثلاً گچ کچی اینٹوں اور گارے کا استعمال کیا گیا اور اس رجحان سے بھی ہوتی ہے کہ عمارات اور دیگر چیزوں کی ساخت کو بے ربط (DISORGANIC) بنا دیا گیا۔ سطحوں پر نقش و نگار تو اصول کے مطابق بنائے گئے لیکن پوری ساخت کو ان سے ڈھانکنے کی پرواہ نہیں کی گئی۔ بعض چیزوں کی ساخت میں بالخصوص عمارتوں کی ساخت میں تجریدی آرائش پیدا کی گئی اور اس کے ذریعہ مختلف عناصر کو الگ الگ کر دینے کے رجحان کی ترجمانی کی گئی۔ یہ مذہبی جمالیات کا نقطۂ نظر اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ پھول پتیوں کے نقش و نگار اور خطاطی نے اسلامی آرٹ میں اتنا نمایاں کردار کیوں ادا کیا

ہے[1]"

خاص خاص عظیم عمارتوں میں کمزور سامان استعمال نہیں کیا گیا تاہم یورپی گرجاؤں میں جو استحکام پایا جاتا ہے اس کی جگہ ان عمارتوں میں صحیح تناسب کے ذریعہ سے حسن اور شان پیدا کی گئی تھی۔ اس وصف کے دو ممتاز نمونے آگرہ کا تاج محل اور دہلی کی وسیع اور حسین جامع مسجد ہے۔

یہ کارنامے گیارہویں اور چودھویں صدیوں کے بعد بھی اس تحدید کے باوجود جاری رہے جو ذہنی تخلیق پر عائد کر دی گئی تھی۔

(۲) ادب۔

ادب کے میدان میں جو کارنامے انجام دیئے گئے ان کا احاطہ زبانوں کے تنوع کے باعث مشکل ہے۔ مجھے فارسی اور اردو ادب سے جتنی واقفیت ہے اور اس کا مقابلہ جس حد تک انگریزی ادب سے کر سکتا ہوں اس کی بناء پر یہ عرض کرنے کی جسارت کروں گا کہ دنیا کے عظیم الشان ادب میں مسلمانوں کا حصہ نہ تو کم ہے اور نہ حقیر ہے۔

---

[1] امبر سیریٹو۔ مودمینٹس آف سویلیزیشن۔ اسلام (تہذیب کی رفتار اور اسلام) کیسل لمیٹڈ۔ لندن ۱۹۷۶ء صفحہ ۱۱

اسلام کی تبلیغ

اسلام کا مقابلہ پہلے یہودیت اور نصرانیت سے ہوا۔ اس کے بعد مشرق کے مذاہب سے ہوا۔ مغرب نے صدیوں تک اسلام کی محرک طاقت اور انسانی ذہن پر اس کے تسلط کا اعتراف نہیں کیا۔ اہلِ مغرب کو ان انقلابی واقعات کا یقین نہیں آیا جو ان کی آنکھوں کے سامنے ہو رہے تھے۔ چنانچہ پیغمبر اسلام کے لئے سب سے شائستہ لقب جو وہ منتخب کر سکے وہ "ساحر" کا تھا۔ وہ ساحر ان معنوں میں تو تھے کہ انہوں نے یکایک ایک انقلاب انسانیت میں پیدا کر دیا۔ لیکن یہ سحر اعلیٰ ترین اور خالص ترین روحانیت کا نتیجہ تھا۔ آپؐ کی تعلیمات آگ کی طرح پھیل گئیں اور آج تک عوام الناس کے ذہنوں پر ان کا غلبہ ہے۔ جبکہ دوسرے مذاہب اپنے اکثر پیروؤں کے لئے محرک فکر و عمل نہیں رہے ہیں۔ انجیل کو مغرب کے پبلک اسکولوں سے خارج کر دیا گیا ہے۔ اور صیہونیت نے وطن کے مسئلہ کو اپنا عقیدہ اور اس دنیاوی عقیدہ کو ایک سیاسی حربہ بنا لیا ہے لیکن جب مسلمان اپنی مخفی طاقت سے کام لینا چاہتے ہیں تو وہ جہاد فی سبیل اللہ کی فکر کرتے ہیں۔ جو ان کے نزدیک محض جنگ نہیں بلکہ ہر مستحسن مقصد

کو حاصل کرنے کی والہانہ کوشش کا نام ہے انہیں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے بے پایاں محبت وعقیدت ہے۔ ان کے دین کی قوتِ محرکہ زندگی کے کسی اور شعبہ میں اتنی واضح نہیں ہے جتنی کہ اپنے عقائد کو دوسروں تک پہنچانے کے شعبے میں۔ اس کے لئے مسلمانوں کا جذبہ اور جوش بہت نمایاں ہے۔ وہ اپنے دین پر اعتقاد پیدا کرانے کی کوشش میں اکثر کامیاب ہو جاتے ہیں کیونکہ دنیا انصاف چاہتی ہے اور ایک خالق پر ایمان سے بہتر کوئی اور بنیاد انصاف ومساوات کے لئے انسانی ذہن فراہم نہیں کر سکتا۔ اس تصور میں ایک ایسی سادگی اور طاقت ہے جس نے عرب کے تخیل۔ ایران کے باریک بین ذہن اور تاتاریوں کے سفاکانہ قلب پر یکساں آسانی کے ساتھ غلبہ پالیا تاتاریوں نے جب اسلام قبول کیا تو وہ تمام عالم اسلام پر فتح پا چکے تھے ان کا اسلام قبول کرنا مسلمانوں کی سیاست یا طاقت کی فتح نہ تھی۔ لیکن فلپ کے۔ ہٹی (PHILLIP K HITTI) کے سوا کسی غیر مسلم مؤرخ میں اتنی وسیع القلبی نہ تھی کہ وہ لکھ دیتا کہ۔

"ان وحشی کافروں کی کہانی جو نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) کے تابعین کی گردنوں پر اپنے قدم رکھے ہوئے تھے اور ساتھ ہی ساتھ مفتوحین کا مذہب قبول کر کے اس کے سرگرم علمبردار بنتے جاتے تھے اس مذہب کی رنگا رنگ تاریخ کی کوئی انوکھی کہانی نہ تھی۔ ان کے بجائے

بند یعنی تیرھویں صدی کے تاتاری نیز ان کے دوسرے
رشتہ دار یعنی اوائل چودھویں صدی کے عثمانی ترک
اسی طریقۂ کار پر عمل کر چکے تھے۔ مسلمانوں کی
سیاست کے ہر تاریک ترین دور میں مسلمانوں کو
نہیں بلکہ مذہبِ اسلام کو ممتاز ترین فتوحات
حاصل ہوئی ہیں[1]۔"

مذکورہ بالا اقتباس کے آخری جملے میں جس خیال کا اظہار کیا گیا ہے اسے اسلام نے ایک دفعہ پھر بیسویں صدی میں صحیح ثابت کر دکھایا ہے۔

دینِ اسلام ان علاقوں میں بھی پھیلا ہے جہاں مسلمانوں کو سیاسی اقتدار حاصل نہ ہو سکا۔ یہ چین میں اندر تک پھیل گیا تھا۔ جزائر فلپین میں بھی اس نے قدم جما لیئے تھے۔ انڈونیشیا میں استحکام کے ساتھ پھیلا اور اب امریکی آبادی کے بعض حصوں کے لیئے جاذب توجہ بنا ہوا ہے۔ افریقہ صدیوں تک اسلامی اقتدار کے طاقتور مراکز سے نزدیک رہا لیکن اسلام وہاں موجودہ صدی میں زیادہ پھیلا ہے، حالانکہ منظم اور دولت مند عیسائی مبلغین نیز یورپ کی لادینی استعماری طاقتیں اس کی مخالفت کرتی رہی ہیں۔ اشتمالی روس میں مسلمانوں کی آبادی سر دست پانچ کروڑ ہے۔ مسلم مؤرخین

---

[1] نلیپ کے۔ ہٹی

کا خیال ہے کہ اسلام کا تصور جب سیاسی مصلحتوں کے ذریعہ مسخ نہیں ہوتا تو اس میں خالص مذہبی جاذبیت زیادہ ہوتی ہے۔ دین کا تحفظ کرنے اور تعمیر سلطنت کے کام کو آزاد چھوڑنے کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم ریاستوں نے تیرھویں صدی کے بعد سے تبلیغ اسلام کی ذمہ داری ترک کر دی۔ مثال کے طور پہ ہندوستان کے بیشتر مسلمان بادشاہ تبلیغ سے کنارہ کش رہے۔ وہ مسلمان ہونے کی وجہ سے تبلیغ کے کام میں مدد تو کرتے تھے لیکن اس کو خود انجام نہیں دیتے تھے۔ اس کی ذمہ داری صوفی درویشوں کے سر تھی حکمرانوں کو اس بات کی مطلق پرواہ نہ تھی کہ درویشوں کی ایماندارانہ تبلیغ اور ہندوستان میں مسلمانوں کے سات سو سال تک حکومت کرنے کے باوجود اس ملک میں ہندوؤں کی اکثریت ہی باقی رہی۔ انہیں مطمئن کرنے کے لئے یہ کافی تھا کہ ہندوستان کے ایک چوتھائی باشندوں نے رضاکارانہ طور پر اسلام قبول کر لیا تھا۔

مجمع الجزائر انڈونیشیا میں اسلام کا پھیلنا اس دین کی باطنی طاقت کا ایک حیرت انگیز کارنامہ ہے۔ مسلمان تجار جو وہاں غالباً آٹھویں اور نویں صدیوں میں پہنچے تھے۔ وہاں کی مقامی آبادی کے لئے جاذبِ توجہ بن گئے تھے۔ تیرھویں صدی میں وہاں آچن سلطنت کی بنیاد تو پڑی لیکن اسلام اس سلطنت کی حدود میں محدود نہ رہا۔ اس نے ہر جگہ نصرانیت۔ بدھ مت اور ہندو دھرم کا مقابلہ

کیا اور آج تک کر رہا ہے۔ جنوبی فلپائن میں مسلمان اقلیت میں ہیں اور وہاں انہیں مورو کہا جاتا ہے لیکن جزیرہ نما ملایا اور جزیرہ بورنیو میں ان کی اکثریت ہے۔ سماترا۔ بورنیو اور سیلبیز میں ان کی اپنی ریاستیں قائم ہیں۔ مسلمانوں کی سب سے زیادہ آبادی کا واحد ملک جزیروں کا ہی مجموعہ ہے۔ یہ کوئی قدیم تاریخ نہیں، حال کی بات ہے اور اسلام کی قوت محرکہ کا کھلا ثبوت ہے۔

بڑی بڑی سلطنتوں کی داغ بیل ڈالنے۔ انہیں فروغ دینے اور ان پر حکومت کرنے کے لئے بھی قوتِ تخلیق اور قوتِ محرکہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر ہم نسلی اور خاندانی اختلافات اور سیاسی سازشوں سے، جنہیں قریب ترین خونی رشتے بھی ختم نہیں کر پاتے صرف نظر کر کے مسلمانوں کی عالمی تاریخ کے کسی نقشے کو دیکھیں تو ہمیں یقین ہو جائے گا کہ مسلمانوں نے سلطنت سازی کا کام تیرھویں صدی سے اٹھارویں صدی تک مسلسل جاری رکھا اگر اسلام میں قوتِ محرکہ نہ ہوتی تو اس میدان میں بھی جمود ہوتا۔

بغداد کی تباہی نے ذہنی سرگرمیوں میں تعطل پیدا کر دیا تھا لیکن سلطنت سازی کا کام اس کے بعد بھی بدستور جاری رہا شکستیں اور نقصانات ہوئے لیکن ان کی تلافی فتوحات اور کامیابیوں سے ہوگئی۔ اندلس میں اگر گیارھویں۔ بارھویں اور تیرھویں صدیوں میں علاقائی نقصان ہوا تو دوسری جگہ بالخصوص ہندوستان میں قابلِ قدر

علاقہ حاصل بھی ہوا۔

اس سلسلہ میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ اندلس میں جو علاقائی نقصانات ہوئے انہوں نے بھی مسلمانوں کو یہی سبق دیا کہ وہ اپنے دین کی طرف زیادہ توجہ دین اور ذہنی سرگرمیاں ترک کر دیں۔ ول ڈورینٹ (WILL DURANT) نے بتایا ہے کہ اس زمانہ میں اسلام کے ساتھ والہانہ وابستگی میں کمی آگئی تھی وہ کہتا ہے۔

"گیارہویں صدی میں شکوک وشبہات کی ایک لہر اُٹھی ----- معتزلہ کی بدعتوں نے بالآخر اندلس میں راہ پائی۔ علماء نے ان کا شدت سے مقابلہ کیا اور گیارہویں صدی میں جب تباہی آئی تو انہوں نے بے دینی کو اس کا سبب قرار دیا۔"[1]

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے مسلمانوں پر سب سے بڑی تباہی تیرہویں صدی کے وسط میں اس وقت نازل ہوئی جب تاتاری وسط ایشیا سے بلائے ناگہانی کی طرح ان پر ٹوٹ پڑے اپنی پہلی یلغار میں انہوں نے ہندوستان سے پہلوتہی کی جہاں سلطنت دہلی پورے شمالی ہند میں اپنا سکہ جمائے ہوئے تھی انہوں نے ایشیائے کوچک کا رُخ کیا اور بالآخر روسا سے واپس لوٹے۔ یہ چھوٹا

---

[1] ول ڈورینٹ۔ دی اسٹوری آف سیویلیزیشن (تہذیب کی کہانی) سائمن اینڈ شسٹر نیویارک ۱۹۵۰ء جلد دی ایج آف منیتھ (مذہب کا دور) صفحہ ۳۰۱

سا مقام ایشیائے کوچک کے ایک گوشہ میں اس سلطنت میں واقع تھا جہاں عثمان اول کی حکومت تھی۔ تاتاری فاتحین جب مسلمانوں سے ملے تو انہیں یہ احساس ہوا کہ وہ روحانی اور ذہنی اعتبار سے کورے ہیں چنانچہ انہوں نے چودھویں صدی کے آغاز تک اسلام قبول کر لیا۔ اس طرح وہ علاقہ جو میدان جنگ میں ذلت آمیز شکستوں کے باعث مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل گیا تھا اسلام کی بدولت انہیں واپس مل گیا اسی صدی کے وسط میں عثمان اول نے جو ممتاز حیثیت کا مالک نہ ہونے کی وجہ سے تاتاریوں کے ہاتھوں سے بچ گیا تھا یورپ کے جزیرہ نما بلقان کو فتح کر لیا پندرھویں صدی علاقائی فتوحات یا نقصانات کے لحاظ سے چنداں اہمیت نہیں رکھتی لیکن سولہویں صدی میں ہنگری رہوڈز اور سائبرس کو عثمانی ترکوں نے فتح کر لیا۔ مسلمان دوبارہ طاقتور بن گئے۔ ان کی عظیم الشان سلطنتیں قائم ہو گئیں۔ عثمانی ترکوں کی سلطنت میں وسطی یورپ۔ مغربی ایشیا عرب اور شمالی افریقہ کا ایک حصہ شامل تھا۔ صفوی سلطنت ایران اور عراق عرب پر حکمران تھی اور ہندوستان میں مسلمان حکمران خاندان یکے بعد دیگرے اپنی سلطنتیں قائم کرتے رہے۔ وسط ایشیا میں بھی مسلمان ہی حکمران تھے۔ اس طرح دنیا کے ایک بڑے حصہ پر مسلمان بلا شرکت غیرے قابض تھے۔ عثمانی ترکوں کی حکومت کی جو شان و شوکت تھی اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ یورپ نے اس حکومت کو رفیع الشان در کے نام

سے موسوم کیا تھا۔ سر تھامس رو (SIR THOMAS ROE) نے جب انگلستان کے جیمس اول کی جانب سے اپنے کاغذات سفارت ہندوستان میں سترھویں صدی میں پیش کئے تھے تو اس شاہی خیمہ وخرگاہ کی شان وشوکت دیکھ کر دنگ رہ گیا تھا جہاں اس کا استقبال کیا گیا تھا اس کے مراسلے سلطنت کی طاقت اور شان وشوکت کی داستان بیان کرتے ہیں۔

یورپ کو سترھویں صدی میں مسلمانوں پر برتری حاصل ہوئی اور اس کے نشاۃ ثانیہ اور صنعتی انقلاب کے ابتدائی مراحل نتیجہ خیز ثابت ہونا شروع ہوئے۔ اس کی زد میں سب سے پہلے عثمانی ترک آئے کیونکہ وہی مغرب سے سب سے زیادہ قریب تھے۔ اس وقت ان کی اور اہل مغرب کی برابر کی ٹکر تھی لیکن عثمانیوں کی مسلسل فتوحات کے دن بیت چکے تھے۔ انہوں نے کریٹ کو فتح کیا تھا۔ پولینڈ سے پوڈولیا کو چھین لیا تھا اور ۱۶۸۳ء میں وائنا کا محاصرہ کیا تھا لیکن جلد ہی پوڈولیا اور ہنگری ان کے ہاتھ سے نکل گئے۔ البتہ مشرق میں مسلم دنیا اس وقت تک محفوظ تھی لیکن یہ تحفظ مختصر عرصے تک برقرار رہا کیونکہ سمندری راستوں پر یورپ کی مستعمر طاقتیں قابض ہو چکی تھیں اور ان کی فنیاتی برتری میں مستعدی کے ساتھ اضافہ ہو رہا تھا۔ اورنگ زیب (۱۶۵۸ء تا ۱۷۰۷ء) نے جو سلطنتِ مغلیہ کا آخری طاقتور بادشاہ تھا۔ سورت کو فتح کر لیا تھا جہاں سے مغربی

تاجر اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھے اور جب انگریزوں نے چٹاگام میں شرانگیزی کی تھی تو اس نے انہیں بنگال سے نکل جانے کا حکم دیا تھا بعد کو ان کے اس وعدے پر کہ وہ شرانگیزی سے باز رہیں گے اور زائرین کو مکے لے جائیں گے اس نے وہ فرمان منسوخ کر دیا تھا۔ اس کارروائی کے ساٹھ سال بعد تک انہوں نے شکایت کا کوئی موقع نہیں دیا۔ چنانچہ اس کے دورِ حکومت میں یہ کبھی احساس تک نہیں ہوا کہ وہ کوئی مدمقابل طاقت بھی تھے بہ الفاظ دیگر اٹھارویں صدی کی ابتدا تک مشرقی دنیا میں مسلمانوں کی سیاسی برتری مکمل طور سے قائم تھی۔ اسی وجہ سے مسلمانانِ عالم نے بحیثیت مجموعی ذہنی جمود کی اس پالیسی کو بدلنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جو انہوں نے خود اختیار کی تھی۔ ہمیں یہ بھولنا نہیں چاہیئے کہ سترھویں صدی کے آخر تک انہیں دنیا میں سب سے اونچا مقام حاصل رہا۔ ان کی سلطنتیں دنیا کی فوقی طاقتیں تھیں۔

مرحلۂ سوم

ردِ عمل --- اٹھارویں اور انیسویں صدیاں

مستعمر طاقتوں سے مسلمانوں کا براہِ راست تصادم اٹھارویں صدی میں ہوا۔ اس تصادم میں مسلمانوں کو جو شکستیں ہوئیں ان کے

بارے میں وہ تقریباً دو سو سال تک اسی وہم میں مبتلا رہے کہ یہ سب دینی عمل میں کسی نہ کسی کوتاہی کا نتیجہ تھیں۔ انہیں اس بات پر کامل اعتقاد تھا کہ ان کے عقائد اگر خالص اور مستحکم رہیں۔ ان میں ذہنی تخلیقات کی آمیزش نہ ہونے پائے تو یہی چیز ان کے سارے مسائل حل کر سکتی ہے بلکہ انہیں فتح و نصرت سے ہمکنار کر سکتی ہے۔ وہ یہی سمجھتے تھے کہ نتائج اگر حوصلہ افزا نہیں نکلے ہیں تو اس کا سبب فقط یہی ہے کہ ان سے اسلام پر عمل کرنے میں کوئی نہ کوئی کوتاہی ہوئی ہے۔ اس لئے وہ دین پر ایمان کے احیا کے کام میں خلوص و تندہی سے مصروف ہو گئے۔ دنیاوی خامیوں اور پسماندگی کی طرف ان کا خیال جاتا ہی نہ تھا۔ میرے اس خیال کی تائید مجھے اتفاق سے برنارڈ لیوی (BERNARD LEWIS) کے مضمون اسلام کا احیاء (THE RETURN OF ISLAM) کی مندرجہ ذیل عبارت ملی ہے۔

"اٹھارویں صدی میں ترکی پر آسٹریا اور روس کی فتوحات اور ہندوستان میں انگریزوں کی کامیابیوں نے جب مسلمانوں کو اس امر کا احساس دلایا کہ وہ دنیا کی سربر آوردہ طاقت نہیں رہے بلکہ یورپ سے جو ہر طرف پھیل رہا تھا لرزہ براندام ہیں تو مسلمانوں میں جو اہم تحریکیں جواباً شروع ہوئیں وہ مذہبی اور اصلاح کی تحریکیں تھیں

مثلاً عرب میں وہابیوں کی تحریک اور ہندوستان میں
نقشبندی سلسلہ جو وہاں سے دیگر ملکوں تک پھیلا۔
انیسویں صدی میں مسلمانوں پر حکومت کرنے والی تین
یورپی طاقتیں برطانیہ۔ فرانس اور روس جب ہندوستان
میں پیشقدمی کر رہی تھیں اس وقت افریقہ اور وسطی
ایشیا میں جو اہم ترین تحریکیں شروع ہوئیں وہ بھی
مذہبی تحریکیں تھیں۔ ہندوستان میں وہابیوں کی
تحریک جو سید احمد بریلویؒ کی سرگرمی میں ۱۸۲۶ء سے
۱۸۳۱ء تک جاری رہی۔ شمالی افریقہ میں ۱۸۳۲ء سے
۱۸۴۷ء تک عبدالقادر کی جدوجہد اور داغستان
اور شمالی کاکیشیا میں ۱۸۳۰ء سے ۱۸۵۹ء تک روسیوں
کے خلاف شامل کی شدید مدافعانہ سرگرمیاں اسی زمرے
میں آتی ہیں۔ یہ تحریکیں اگرچہ کچل دی گئیں تاہم اس
زمانہ میں ان کا اثر بہت ہوا۔ مسلمان پھر یورپ کی طاقت
دولت اور کامیابیوں سے اتنے مرعوب ہوئے کہ یورپی
طور طریقوں کی نقل کرنے لگے۔ انیسویں صدی کے وسط
سے یورپ کی توسیع پسندی میں اور اضافہ ہوا ہندوستانی
غدر کو فرو کرنے کے بعد ہندوستان میں مغل شہنشاہیت
کے آخری آثار بھی مٹا دیئے گئے اور اس مسلم سلطنت

میں برطانوی حکومت کے قدم مضبوطی سے جم گئے۔ روسیوں نے مشرقی ایشیا میں تیزی سے پیش قدمی کی۔ فرانسیسیوں نے تونس میں اور انگریزوں نے مصر میں اقدام کیا عثمانی ترکوں کی سلطنت بھی خطرات میں گھِر گئی۔ ان سب باتوں کا ردِ عمل اتحاد اسلامی کی تحریکوں کے ایک سلسلے کی شکل میں رونما ہوا[1]۔"

(اقتباس کو خط کشیدہ ہم نے کیا ہے)

آگے چل کر اتحاد اسلامی تحریک کا سرسری ذکر کیا جائے گا۔ مندرجۂ بالا عبارت ہمیں انیسویں صدی کے آخر تک پہنچا دیتی ہے حالانکہ ہمارا مقصد آگے بڑھنے سے پہلے اٹھارویں اور انیسویں صدیوں کے واقعات کا بغور جائزہ لینا ہے۔

احیائے اسلام کی تحریک کے بارے میں مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے اپنے ایک کتابچہ ۱۹۴۰ء میں ان صدیوں (اٹھارویں اور انیسویں) کی خاص خاص تحریکات احیاء کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ وہ اصحاب جو ہندوستان میں احیائے مذہب کے سرگرم کارکن بنے وہ انحطاط کے دنیوی اسباب کو معلوم کرنے سے کیوں قاصر رہے۔ انہیں یہ معلوم کرنے کا خیال کیوں نہیں آیا کہ مغرب کن ذرائع سے برتری حاصل کر رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

---

[1] لیوس برنارڈ۔ دی رٹرن آف اسلام۔ کمنٹری۔ جنوری ۱۹۷۶ء

"یہاں (غیر منقسمہ ہند میں) تقریباً پانچ سو سال سے طبیعی سائنسوں اور مادی طاقتوں کے علم پر جمود طاری تھا۔ مغرب میں علم کے ان شعبوں میں غیر معمولی ترقی ہوئی اور اہلِ مغرب کو اس کی بدولت ایسی قوت حاصل ہو گئی کہ پرانے اسلحہ اور تدبیروں سے ان کا مقابلہ کرنا تقریباً ناممکن ہو گیا۔

"زیادہ تعجب انگیز بات یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ نے ان حالات میں کہ انگریزوں نے بنگال پر ان کے زمانے میں قبضہ کر لیا تھا اور الٰہ آباد تک کا علاقہ ان کے زیرِ نگیں آگیا تھا ان کے تیزی سے بڑھتے ہوئے قدموں کو روکنے کی جانب خاطر خواہ توجہ نہیں کی۔ شاہ عبد العزیز نے اس امر کے باوجود کہ برطانوی بالادست طاقت نے دہلی کے بادشاہ کو اپنا قیدی بنا لیا تھا اور تقریباً سارے ہندوستان پر اپنا قبضہ جما لیا تھا۔ برطانوی قوم کی بالادستی اور اس کے اسباب کی جانب توجہ کرنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی۔ یہاں تک کہ سر سید اور شاہ اسماعیل کو بھی جن کا مقصد ہی اسلامی انقلاب تھا اور جنہوں نے اس کو کامیاب بنانے کے لئے حتی المقدور تمام تیاریاں اور انتظامات کئے تھے یہ خیال نہ

آیا کہ وہ قابل علماء کا ایک وفد یورپ بھیج کر اہل یورپ کی برتری کے اسباب کی تحقیق کرتے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس معاملے کے اتنے اہم پہلو کو انہوں نے کیسے نظر انداز کر دیا۔[1]"

(اقتباس کو خط کشیدہ ہم نے کیا ہے)

مجھے مولانا صاحب کی حیرت پر اس وجہ سے حیرت ہے کہ ان کی حیرت علمائے دین کے طرز تفکر میں حیرت انگیز تبدیلی کا ثبوت ہے اس سے پہلے اچھے اچھے مسلمانوں کو کبھی یہ احساس تک نہیں ہوا تھا کہ کوئی چیز ایسی بھی ہو سکتی ہے جسے ایمان کے پختہ کرنے کے سوا کسی اور ذریعہ سے حاصل کیا جا سکتا ہو۔ ان کی سرگرمیاں تبلیغ و تطہیر دین اور حصول شہادت کی تگ و دو تک محدود تھیں۔ اس زمانے میں اگر علماء کا وفد یورپ جاتا بھی تو کوئی فائدہ نہ ہوتا کیونکہ ہمارے علماء میں دنیوی اسباب کے تلاش کی صلاحیت کب پیدا کی گئی تھی؟ حقیقت یہ ہے کہ مولانا صاحب کا مندرجۂ بالا خیال زاویۂ نگاہ میں تبدیلی ظاہر کرتا ہے اسی لئے ان کو حیرت ہوئی کہ علماء نے یورپ جا کر وہ ذرائع کیوں معلوم نہیں کئے جن کی مدد سے یورپ مسلمان ملک پر حاوی ہوتا جا رہا تھا۔ ان کے خیال کی زبان ہی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جو خیال ظاہر کیا گیا

---

[1] مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ احیائے اسلام کی تحریک۔ ادارہ مطبوعات اسلامی لاہور ۱۹۶۳ء۔ صفحات ۱۱۲ تا ۱۱۳

ہے وہ پچاس سال سے پرانا نہیں ہے۔

انیسویں صدی کے دوسرے نصف حصے میں دنیائے اسلام میں ایسے اشخاص پیدا ہوئے جنہوں نے دنیوی علوم حاصل کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ ان میں سر سید احمد خاں اور چند دوسرے اشخاص پیش پیش تھے لیکن ان کا زیادہ تر وقت تقلید پسند فکر کے نمائندوں سے لڑنے جھگڑنے میں گذرا جو اس بات سے خائف تھے کہ جدید علم کی تحصیل مسلمانوں کو دین سے برگشتہ کر دے گی۔ تقلید پسند مکتبِ فکر کے ان نمائندوں نے اپنے نقطۂ فکر کی تائید میں قرآن کریم۔ احادیث اور فقہ کے خوب خوب حوالے دیئے۔ وہ جانتے تھے کہ مخالف نقطۂ نظر کی تائید بھی یکساں شد و مد کے ساتھ انہیں ذرائع سے کی جاسکتی ہے لیکن اُنہوں نے قرآن۔ احادیث اور فقہ پر اس لئے زور دیا کہ جدت پسند اصحاب اسلام کے بنیادی اصولوں پر اکثر حملے کرتے تھے اور تقلید پسندوں نے اپنے جوش میں یہ بات فراموش کر دی کہ ایسے حملے کرنے والوں کی تعداد بہت کم تھی مگر تقلید پسندوں کے خیلالات منظم تھے۔ اس کے برعکس حزبِ مخالف اپنے دلائل سے پوری طرح لیس تھی صرف چند عظیم شخصیتوں مثلاً جمال الدین افغانی۔ محمد عبدہ۔ سید امیر علی علی عبدالرزاق۔ محمد کرد علی۔ طٰہٰ حسین۔ راشد عبداللہ قاسمی۔ رشید رضا ضیا گو کلپ اور اسماعیل گاسپر د کی کو جدید ضروریات کا علم تھا۔ یہ سب ہی اگرچہ عالم و فاضل اشخاص تھے اور مسائل سے پوری طرح

واقف تھے۔ تاہم وہ عوام کو اس بات کا قائل نہ کر سکے کہ جدید علم اور سائنس کے بارے میں جو خیالات ان کے دل و دماغ پر بٹھا دیئے گئے ہیں وہ محض قدامت پسندی پر مبنی ہیں۔ ان کے مخالفین کو ان سے بہت زیادہ عوام سے قربت حاصل تھی۔ ڈاکٹر محمد اقبال کو بحیثیت شاعر اپنے ملک میں مذکورہ حضرات کی نسبت کہیں بہتر مقام حاصل ہوا کیونکہ ان کی شاعری بہت مقبول تھی اور ہے لیکن جوں جوں ان کے مداحین کا دائرہ وسیع تر ہوتا جا رہا ہے ان کے وہی خیالات مقبولیت پا رہے ہیں جو قدیم خیالات سے مطابقت رکھتے ہیں۔ ان کے اشعار کو تقلید پسند علماء بھی پیش کرتے ہیں اور جدت پسند علماء بھی تاہم ان کا سب سے بڑا کارنامہ نہ تو ان کا فلسفہ ہے اور نہ ان کے اشعار ہیں اور نہ ہندوستان کی تقسیم کی جرأت مندانہ تائید ہے بلکہ اسلام کے لئے وہ جوش اور ولولہ ہے جو انہوں نے ان جدت پسندوں میں پیدا کیا جو لادینیت کے سرد خانوں میں جامد ہوتے جا رہے تھے۔

انیسویں صدی نے بحیثیت مجموعی تین زبردست تخیلاتی انقلاب پیدا کئے۔ ان میں سے ایک مسلمانوں کی ریاستوں کے اتحاد کا خیال تھا۔ یہ تخیل عقلاء کے ذہن کی ایک قبل از وقت پیداوار تھا۔ اسے مسلمانوں کی ریاستوں نے کوئی اہمیت نہیں دی کیونکہ ان کی اپنی کمزوری نے انہیں غیر مسلم طاقتوں سے منسلک رہنے پر مجبور کر رکھا تھا۔ لیکن اس تخیل میں جو صلاحیتیں تھیں ان کی وجہ سے مغرب اس کا دشمن ہوگیا

اور اس کی ریشہ دوانیوں کے باعث اس پر عمل نہ ہو سکا۔ دوسرا انقلاب خالص اسلام کے تصور کی مقبولیت نے پیدا کیا۔ اس نے تقلید پسندوں کے ذہن کو منقلب کر دیا وہ حقیقت پسند بن گئے۔ یہ خیال شیخ محمد ابن عبدالوہاب نجدی (۱۷۰۳ء تا ۱۷۹۲ء) نے عرب میں وہابی تحریک کے ذریعہ عام کیا اور ہندوستان میں مولانا اسماعیل شہید اور سید احمد شہید جیسے درویش علماء نے ایک جداگانہ لیکن اس سے ملتی جلتی تحریک کے ذریعہ مقبول بنایا۔

تیسرا انقلاب افریقہ میں تصوف کی نئی شکل میں رونما ہوا۔ اس براعظم کے صوفیا میں قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کا یہ رجحان کہ وہ اپنے فرائض کی انجام دہی سے روحانی سکون اور بلندی حاصل کرتے تھے عود کر آیا۔ چنانچہ وہ مجاہد بن گئے۔ اس انقلاب کا ثبوت تجانیہ ادریسیہ اور سنوسیہ تحریکوں سے ملتا ہے۔ اس کی بدولت عبدالکریم مراکشی اور المہدی سوڈانی جیسے اشخاص پیدا ہوئے۔ یورپ کی نوآباد کار طاقتیں ان انقلابات کی شدید مخالف تھیں۔ انہوں نے ان کو بدعت فی الاسلام سے منسوب کرانے اور بزورِ شمشیر کچلنے کی پوری پوری کوشش کی۔

سیاسی اعتبار سے مسلمان انیسویں صدی کے آخر تک زوال پذیر ہو چکے تھے۔ یورپ ترکی کو "مردِ بیمار" کہتا تھا۔ برطانیہ اپنے اس اقتدار کی بنا پر جو اسے شریفِ مکہ اور ہندوستان پر حاصل تھا اپنے کسی پٹھو

کو مسلمانوں کا خلیفہ بنانے کے منصوبے بنا رہا تھا ولفرڈ اسکاؤن بلنٹ (WILFRID SCAWEN BLUNT) کے مضامین "اسلام کا مستقبل"، جو پہلی بار ۱۸۸۲ء میں شائع ہوئے تھے اور پھر کتاب کی شکل میں شائع ہوئے۔ اس زمانے کے حالات و واقعات کے لحاظ سے پڑھنے کے لائق ہیں۔ وہ ایک بہت با اثر اور واقف کار انگریز تھا۔ اسے برطانوی حکومت میں اپنے اثر و رسوخ پر اتنا اعتماد تھا کہ اس نے اپنے مضامین کے مجموعہ کے پیش لفظ کے آخر میں یہ لکھا تھا۔

"اگر وہ یعنی (مسلمانانِ عالم) یہ سمجھتے ہیں کہ مصنف ان کی اس آزادی (خلافت کے ذریعہ دینی قیادت) کو برقرار رکھنے کے سلسلے میں ان کی کوئی مدد کر سکتا ہے تو وہ اس پر اس کے اختیارات کی حد تک بلا تکلف اعتماد کر سکتے ہیں اور اسے یقین ہے کہ وہ اپنے خلوص کا ثبوت انہیں ان مضامین کی اشاعت سے جو اس سلسلے میں پہلا قدم ہے بہتر شکل میں مہیا کر سکے گا۔"[1]

یہ کتاب برطانوی پالیسی کے انکشاف، مصنف کی دل شکن پیشگوئیوں اور ان ہمدردانہ مشوروں پر مشتمل ہے جو اس نے مسلمانانِ عالم کو دیئے تھے۔ وہ کہتا ہے:۔

---

[1] ولفرڈ اسکاؤن بلنٹ - دی فیوچر آف اسلام (اسلام کا مستقبل) سندھ ساگر اکیڈمی لاہور - صفحہ ۱۰

"دنیائے اسلام میں ہر طرف سیاسی تحریکیں زور پکڑ رہی ہیں۔ اسے (یعنی مصنف کو) یقین ہے کہ اس کے ملک کو چند ماہ کے اندر اندر ہندوستان سے متعلق اس امر کا فیصلہ کرنا ہوگا کہ مذہبی جوش وخروش کی وہ تحریک جو (افریقہ میں دبائے جانے کے بعد) اس کی طرف بڑھ رہی ہے اسے دبایا جائے یا جاری رکھا جائے اس کے (یعنی مصنف کے) نزدیک یہ بات بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ وہ (یعنی مسلمان) کم از کم اس مسئلہ کی خاص خاص باتوں سے واقف ہو جائیں جو دنیا میں اُنہیں درپیش ہیں۔"[1]

خاص خاص باتیں اس کے خیال میں یہ تھیں کہ ترکوں نے مسلمانوں کو اور اسلام کو بہت نقصان پہنچایا تھا۔ وہ سمجھتا تھا، حالانکہ اس میں کوئی اصلیت نہ تھی، کہ ترکوں نے اجتہاد کا گلا گھونٹ دیا تھا اور وہ بہت جلد یورپی طاقتوں کے ہاتھوں فنا ہو جانے والے تھے اس کا خیال تھا کہ پھر کوئی خلیفہ نہیں رہے گا گو کہ خلافت کا وجود اسلام کے روحانی اور دنیوی مفادات کو یکجا کرنے کے لئے ضروری تھا۔ مسلمان بادشاہوں میں مقاماتِ مقدسہ کے تحفظ کا حق حاصل کرنے کے لئے

---

[1] ولفرڈ اسکاؤن بلنٹ۔ دی فیوچر آف اسلام (اسلام کا مستقبل) سندھ ساگر اکیڈمی۔ لاہور صفحہ ۵

تصادم ہو گا۔ علاوہ ازیں ترکی کا مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل جانا "امت محمدیہ کے لئے لازماً تباہ کن ہو گا۔"[1]

"اگر عثمانی ترک جنہیں یورپ صدیوں سے اسلام کے وجود کی علامت سمجھتا رہا ہے کسی دن اسلام سے پھر گئے تو یہ تاریخ کا عجیب و غریب انتقام ہو گا لیکن یہ ایک ایسا انتقام ہے جو ہمارے بچوں اور پوتوں کی زندگی میں ظہور کر کے رہے گا۔"

مسلمانوں کا مستقبل تاریک تھا چنانچہ اس نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ وہ مستقبل کے ناخوشگوار امکانات سے خوش اسلوبی کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کریں کیونکہ:-

"ان کی سلطانی کا دور گذر چکا ہے لیکن ان کے لئے معاشرتی آزادی کا دور ابھی (برطانوی تحفظ کے تحت) باقی ہے وہ تحفظ متمدن اور اصلاح یافتہ ہونے اور اپنی ہمہ گیر ہمدردیوں کے باعث ان کے دور سلطنت سے ان کیلئے بہتر ہو گا۔ مسلمانوں کو اپنے آبائی وطنوں مثلاً عرب۔[2]

---

[1] ولفرڈ اسکاوُن بلنٹ۔ دی فیوچر آف اسلام (اسلام کا مستقبل) سندھ ساگر اکیڈیمی۔ لاہور۔ صفحہ ۱۸۱

[2] ولفرڈ اسکاوُن بلنٹ۔ دی فیوچر آف اسلام (اسلام کا مستقبل) سندھ ساگر اکیڈیمی۔ لاہور۔ صفحہ ۱۸۴

مصر اور شمالی افریقہ میں سیاسی تباہی کا اندیشہ نہ ہونا چاہیئے۔ اور ان کو ہی اس وقت تک دار الاسلام سمجھنا چاہیئے جبتک حالات بہتر نہیں ہو جاتے۔"[1]

اس کے خیال میں مسلمانوں کے لئے بہترین راہِ عمل یہ تھی کہ خلافت کو جلد ترکی سے ملک عرب میں منتقل کر لیں کیونکہ وہاں برطانیہ کی حکمرانی "سکون و راحت اور تحریکِ فکر و عمل کا سرچشمہ بنی ہوئی تھی۔"

انیسویں صدی اس طرح اختتام کو پہنچی کہ مسلمانانِ عالم کے سروں پر غم و اندوہ کے تاریک بادل چھائے ہوئے تھے۔ قصور نہ آسمان کا تھا نہ بادلوں کا کیونکہ وہ بادل ان بخارات سے بنے تھے جو خود دنیائے اسلام کی غفلت نے پیدا کئے تھے۔ ان بادلوں کو مسلمان چھانٹ نہ سکے لیکن لگاتار چیلنجوں اور استعمار کی بوالہوسی اور ذلتوں نے دنیائے اسلام کے اندرونی حالات میں انقلاب پیدا کیا۔ اس میں شک نہیں کہ دنیائے اسلام کی حیثیت مغرب کے ایک قیدی کی سی تھی لیکن ان قیدیوں کی روح کو مغرب اسیر نہ کر سکا البتہ وہ مسلمان غیر ملکی حکمرانوں کے آلۂ کار بنے رہے جنہیں لالچ یا رشوت دے کر خرید لیا گیا تھا۔

---

[1] ولفرڈ اسکاؤن بلنٹ۔ دی فیوچر آف اسلام (اسلام کا مستقبل) سندھ ساگر اکیڈیمی۔ لاہور صفحہ ۱۰

بیسویں صدی

بیسویں صدی کے نصف حصے نے مسلمانوں کی آنکھیں کھولیں۔
پہلی عالمی جنگ نے مغربی تہذیب کی کمزوریوں اور خرابیوں کو آشکارا
کر دیا اشتمالیت نے ان کے اس زعم کو کہ ان کی معیشت بڑی مستحکم ہے
ضرب کاری لگائی۔ مستعمر طاقتوں کا وقار خاک میں مل گیا اور ان کی
اندرونی کمزوریوں نے ان کے پاس فوجی برتری کے سوا کچھ اور نہ چھوڑا
برطانیہ عظمیٰ دیوالیہ ہو گیا لیکن ریاستہائے متحدہ امریکہ نے اسے فنا
ہونے سے بچا لیا۔ نو آبادیوں میں اضطراب شروع ہوا۔ یورپی مفکرین
کو محسوس ہوا کہ مغرب کی روح مجروح ہو گئی ہے۔ اس ذہنی اور روحانی
خلفشار کی حالت میں اتحادی طاقتوں نے ایسے صلح نامے کئے جنہوں
نے کسی مسلمان ریاست کو محفوظ نہیں چھوڑا۔

ترک پہلی جنگ عظیم میں جرمنی کے ساتھ تھے۔ جنگ کے دوران
میں برطانیہ کے محکمہ جاسوسی نے اپنے کارندے عرب بھیجے جو ان دنوں
ترکی کے زیرِ نگیں تھا کہ وہاں بغاوت کے بیج بوئیں۔ ایک شخص لارنس
نے جو بعد کو عرب کا کھلایا عربوں سے امداد کے جھوٹے وعدے کئے
اور انہیں ترغیب دی کہ وہ ترکی سے تمام سلسلۂ مواصلات منقطع
کر لیں۔ اس طرح عرب قومیت کی داغ بیل ڈالی گئی۔ اتحادی طاقتوں

نے حکومت خود اختیاری کے جس اصول کو سلطنتوں کے حصے بخرے کرنے کے لئے استعمال کیا تھا وہی عربوں کو بغاوت پر آمادہ کرنے کے لئے طعمہ کے طور پر پیش کیا گیا۔ آج اسی عرب قومیت پر انگلیاں اٹھائی جاتی ہیں اور اسے اسلام کی کمزوری بتایا جاتا ہے۔

یہودی اپنے لئے کسی وطن کی تلاش میں تھے چنانچہ انہی اور ان کی خاطر لارڈ بلفور (BALFOUR) نے ۱۹۱۷ء میں یا تو فیاضانہ جذبے کے تحت یا پھر اس احساسِ شرمندگی کو مٹانے کے لئے جو یہودیوں کو ۱۲۹۰ء میں انگلستان سے نکالنے کے باعث اسے ہوا تھا۔ یہودیوں سے وعدہ کر لیا کہ وہ فلسطین کو ان کا وطن بنائیں گے۔ اس اقدام میں فیاضی یا خفت مٹانے کے جذبے سے زیادہ مسلم دشمنی کا جذبہ کارفرما تھا۔

فلسطین برطانیہ کی ملکیت نہ تھا۔ بلکہ برطانیہ نے اپنی ایک فتح کے سلسلے میں فلسطین پر عارضی اختیار حکمرانی حاصل کیا تھا لیکن یہودیوں کو وہاں آباد کر کے اس نے اس اختیار کا غلط استعمال کیا۔ سارے مغربی ممالک اس کے ہم خیال ہو گئے اور ۱۹۴۸ء میں اقوام متحدہ کی منظوری سے دنیائے اسلام کے قلب میں جمہوریہ اسرائیل قائم کر دی گئی۔

ترک سخت جان ثابت ہوئے۔ ان کے خلاف فرانس۔ اٹلی۔ روس اور برطانیہ کی سازشوں کے بارے میں اے۔ جے۔ ٹوائن بی

(A.J.TOYNBEE) اور کے۔پی کرک وڈ (K.P-KIRKWOOD) نے ترکی کے موضوع پر اپنی کتاب میں جو کچھ لکھا ہے اس سے حقیقت حال کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ ان طاقتوں نے ترکوں کو نیست ونابود کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ ترکی کی کھال سر سے پیر تک اتارنے کے بعد وہ اس کو کھا جانے کے لئے تیار تھیں۔

"پڑاؤ کی آگ کے گرد منڈلانے والے بھیڑیوں کی طرح یہ طاقتیں اس کے (یعنی ترکی کے) دروازے پر خونخوار نظروں کے ساتھ چکر کاٹ رہی تھیں کیونکہ ترکی فطرتاً مال دار تھا اور استعمار حریص۔"[1]

لیکن مدافعت کے حیرت انگیز کارناموں اور معجزانہ تائیدِ غیبی کی بدولت ترکی اب تک زندہ ہے اور عقائد کے اعتبار سے سچا مسلمان ملک ہے۔ مغربی ممالک ہمیشہ خلافت کے دشمن رہے ہیں۔ چنانچہ ترکوں نے عاجز آکر اپنے ملک سے خلافت کو ختم کر دیا اور اس ذمہ داری کو دوسرے مسلم ممالک کو سونپ دیا۔ دنیائے اسلام اس صدمہ کو بھی جھیل گئی۔ لہٰذا بلنٹ (BLUNT) نے اس بارے میں جو پیش گوئی کی تھی وہ صحیح ثابت نہیں ہوئی۔

مغرب نے بنی نوعِ انسان کو نسل پرستی۔ علاقائی قومیت

---

[1] اے۔جے۔ ٹوائن بی اور کینتھ پی کرک وڈ۔ ترکی ارنسٹ بین لمیٹڈ۔ لندن صفحہ ۶۸

اور اسرائیل کی ریاست کے تین زہریلے تحفے دیئے ہیں۔ طاقت اور دولت حاصل کرنے کے لئے رقیبانہ اور حریفانہ جذبہ کو مغرب نے ایک مقدس مشغلہ بنا دیا ہے۔ یہ جذبہ ابھی تک مشرق پر مسلط نہیں ہوا ہے۔ دنیا بھول رہی ہے کہ رقابتوں اور خود غرضیوں نے انسانی تاریخ کو ہمیشہ داغ دار بنایا ہے۔ یہ جذبہ سرمایہ دارانہ مغرب میں تو قابلِ احترام وصف سمجھا جاتا رہا ہے لیکن مشرق میں کبھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا۔ ممکن ہے کہ ایک تیسری عالمی جنگ اور ہو تو بنی نوع انسان کچھ سبق سیکھ لے۔

آپس میں حریفانہ مقابلہ کا جذبہ مغرب پہ دوسری بار ۱۹۳۹ء میں دوسری عالمی جنگ کی شکل میں مسلط ہوا۔ مغربی تہذیب کا سارا جسم خون چکاں ہو گیا۔ اس لئے یورپی نو آبادیات خود مختاری حاصل کرنے کے لئے بیچین ہو گئیں۔ سیاسی کشمکش ہر جگہ شروع ہو گئی اور نو آباد کار طاقتیں نو آبادیات پر زیادہ عرصے تک قابض رہنے سے قاصر ہو گئیں۔ مسلمانوں نے اپنی جد و جہد شروع کی ان کے پاس صرف دو حربے تھے۔ ایک مشرقی اور دوسرا مغربی۔ مشرقی حربہ اسلام تھا۔ اور مغربی حقِ خود مختاری۔ وہ اسلام اور حقِ خود اختیاری دونوں کی بناء پر لڑے۔ اسلام کی بناء پر اس لئے کہ ان کے پاس کوئی اور محرک قوت نہ تھی اور حقِ خود اختیاری کی بناء پر اس لئے کہ وہی ایک دلیل تھی جسے غیر مسلم دنیا آسانی سے سمجھ سکتی تھی۔ ۱۹۴۵ء سے آج تک

وہ ایشیا اور افریقہ کے ۴۷ ملکوں میں حکمراں بن گئے۔ یہ فتح انہیں آسانی سے حاصل نہیں ہوئی۔ انہیں اپنے عزم سرکشی اور سرکشی سے نوآبادکار طاقتوں کو اس بات کا قائل کرنا پڑا کہ ان پر مزید حکومت نہیں کی جا سکتی۔ چنانچہ یہ طاقتیں جو خود اپنی داخلی کمزوری کا شکار ہو رہی تھیں اپنا بوریہ بستر لپیٹ کر رخصت ہونے پر مجبور ہو گئیں۔

حقیقی آزادی کی منزل سے مشرق ابھی بہت دُور ہے لیکن اِسے جو کچھ حاصل ہوا ہے وہ بھی نہ ہوتا اگر روس ایک فوقی طاقت اور مغرب کا حریف نہ بنتا۔ چین بھی ۱۹۴۹ء میں آزاد ہو گیا اور اب وہ قومی برادری میں اپنا جائز مقام تیزی سے حاصل کر رہا ہے۔ اس نے تیسری دنیا کی طاقت میں اضافہ کر دیا ہے۔

دنیائے اسلام ابھی تک ان زخموں کو مندمل کرنے میں مصروف ہے جو دو سو سال سے زیادہ عرصے کی غلامی نے ڈالے ہیں اور اس صدمے سے جان بر ہونے کی کوشش کر رہی ہے جو بہت بڑی بلندی سے گرنے کے باعث اسے پہنچا ہے۔ جے۔ اسپنسر ٹرمنگھم (J. SPENCER TRIMINGHAM) نے یہ کہہ کر دنیا کے مؤرخین کی ترجمانی کی ہے کہ:

> "۱۷۹۸ء میں مصر پر نپولین کی فتح کو عام طور سے وہ واقعہ سمجھا جاتا ہے جس سے اُنہیں (یعنی مسلمانوں کو) پہلی بار اس خطرے کا احساس ہوا جو یورپی توسیع

پسندی کے باعث لاحق ہو گیا تھا۔[1]

دنیا کی کوئی قوم اپنی شکست سے اس قدر انتشارِ ذہنی میں مبتلا نہیں ہوئی جیسی کہ مسلمان قوم ہوئی۔ تاہم پچھلے تیس سال کے دوران میں ان کی حالت اس سے دس گنا بہتر ہو گئی ہے جیسی کہ اس دو سو سال کے عرصے میں تھی جبکہ کالی۔ بھوری اور زرد نسلوں کا بوجھ سفید فام اقوام نے اُٹھانے کا دعویٰ کیا تھا۔ دنیائے اسلام اس اعتبار سے خوش قسمت رہی کہ اس میں تیل نکل آیا۔ اس کی غلامی کا دور اب تقریباً ختم ہو گیا ہے۔ نئی ذمہ داریاں اسے مجبور کر رہی ہیں کہ وہ اجتہاد کا اعادہ کرے وہ اپنی آزادی میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لئے بےچین ہے اور اس مقصد کے بیشِ نظر علوم و فنون میں استعداد پیدا کرنے اور مذہبی خصوصیات کو نئے حالات سے ہم آہنگ کرنے کی خواہاں ہے۔

نئی قوتِ محرکہ

مندرجۂ بالا بیان سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ مسلمانوں کو بڑے بڑے اندرونی اور بیرونی مسائل درپیش نہیں ہیں۔ میرے نزدیک جو بات سب سے زیادہ امید افزا ہے وہ تقلید پسند مکتبِ فکر کی قلب

---

[1] جے۔ اسپینسر ٹرمنگھم۔ دی صوفی آرڈرز ان اسلام (اسلام میں تصوف کے سلسلے) آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔ لندن ۱۹۷۱ء صفحہ ۱۵

ماہیت ہے۔ ہندوستان کے عالم ابو الحسن علی ندوی کی "ذہنی نوعِ انسان پر مسلمانوں کے عروج وزوال کے اثرات" جس کا حوالہ پہلے دیا جا چکا ہے۔ اس لحاظ سے منفرد ہے کہ میرے علم میں کوئی دوسرا مسلمانوں کا درویش صفت عالم ایسا نہیں ہے جس نے ملّی نقطۂ نظر میں تبدیلی کی ضرورت پر اتنا زور دیا ہو۔ ان کی تحریک روحانی ہے لیکن ان کے خیالات میں جدت بھی ہے مگر وہ خالص روایتی انداز میں پیش کئے گئے ہیں۔ وہ مسلمانوں کی موجودہ مشکلات کے صرف دو علاج تجویز کرتے ہیں۔ ایک اجتہاد ہے اور دوسرا جہاد۔ یہ دونوں الفاظ اصطلاحی معنی میں نہیں لغوی معنیٰ میں استعمال کئے گئے ہیں۔ ان الفاظ سے جو روح پرور روایات وابستہ ہیں وہ منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے والہانہ جدوجہد کی ترغیب دیتی ہیں۔ پہلے لفظ سے مراد ذہنی تخلیق ہے اور دوسرا لفظ ہر طرح کی لگاتار کوشش و محنت کا ترجمان ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ انقلاب اس وقت تک بے معنیٰ ہے جبتک کہ کوئی اعتقاد۔ کوئی قابل قدر تخیل۔ مقصد کا کوئی پختہ اور دانشمندانہ شعور کارفرما نہ ہو۔ یہ مقصد مسلمانوں کے لئے عالمِ انسانی کی قیادت ہے۔

مذکورہ بالا کتاب عربی میں لکھی گئی تھی۔ لیکن اس کا ترجمہ فارسی۔ ترکی۔ اُردو اور انگریزی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ (انگریزی ترجمے کو اسلام اور دنیا کا عنوان دیا گیا ہے۔) اُردو ترجمے کی طبع ہشتم

کے صفحات ۴۲۴ – ۴۲۵ اور ۴۲۷ میں مصنف نے نہایت پُر زور الفاظ میں تلقین کی ہے۔ کہ مسلمانوں کا مطمح نظر علوم اور فنیات میں دیگر اقوام کی محض ہمسری نہیں بلکہ قیادت ہونا چاہیئے۔ مغربی صنعت و تجارت کا حوالہ دیتے ہوئے وہ کہتے ہیں:-

"سائنس اور فنیات کے اس شعبے کو دنیائے اسلام نے نظر انداز کیا تھا جس کی پاداش میں اسے عرصہ دراز تک ذلت و خواری کی زندگی بسر کرنا پڑی۔"[1]

تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے وہ یہ نکتے کی بات بیان کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو یہ آزادی کہ وہ جیسی تعلیم چاہیں حاصل کریں اس وقت تک کوئی معزز مرتبہ عطا نہیں کر سکتی جب تک وہ علم کے مختلف شعبوں میں قیادت حاصل نہ کر لیں۔ اگر علوم و فنون میں کمال حاصل نہیں کر سکتے تو آزادی بھی برائے نام ہی ہو گی بلکہ شاید عارضی ہو۔

یہ کتاب ۱۹۷۴ء تک ۲۲ بار طبع ہو چکی ہے۔ اس کے خیالات جدت پسندوں اور اس کا انداز تقلید پسندوں کے لئے جاذبِ توجہ رہا ہے۔ تقلید پسندوں کے مکتبِ فکر کے کسی نمائندے نے ان سے قبل علوم سائنس اور علوم دنیوی کے حصول پر اتنا زور نہیں دیا

---

[1] ابوالحسن علی ندوی۔ بنی نوع انسانی پر مسلمانوں کے عروج و زوال کے اثرات۔ مجلس نشریاتِ اسلام۔ کراچی۔ طبع ہشتم صفحہ ۴۲۵

جتنا کہ اُنہوں نے دیا ہے کیونکہ انہیں یقین تھا کہ ان علوم کی تحصیل ہی کے ذریعہ مسلمان بنی نوع انسان کی سربراہی کے اسلامی تقاضے کو پورا کر سکتے ہیں۔ یہ اس بات کی واضح علامت ہے کہ ذہنی اعتبار سے بھی اسلام کے پیش قدمی کرنے کا امکان ہے۔

نئی جان بخش طاقت کا اعتراف

دنیا نے بھی مسلمانوں میں ایک تبدیلی محسوس کی ہے۔ اس حقیقت کو ثابت کرنے کے لئے چار مسلم الثبوت تصانیف کے حوالے دیئے جائیں گے۔ یہ حوالہ جات اس دعوے کو ثابت کرنے کے لئے غالباً کافی ہوں گے کہ مسلمانوں کے پیچھے رہ جانے کا یہ سبب نہیں تھا کہ ان میں صلاحیت باقی نہیں رہی تھی۔

انسائیکلوپیڈیا امریکانہ (۱۹۷۴ء) نے اسلام کی قوتِ محرکہ کا اعتراف محتاط انداز اور تامل کے ساتھ ان الفاظ میں کیا ہے:-

> "کئی صدیوں کے بعد جن میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسلام میں جان باقی نہیں رہی ہے اس نے ایک بار پھر کروٹ لی ہے۔ مسلمان جن کی آبادی تمام دنیا کی آبادی کا ایک بٹا ساتواں حصہ یا اس سے بھی زیادہ ہے۔ تعداد۔ دولت اور اہمیت میں روز بروز ترقی

کر رہے ہیں "

"اس نئی توانائی نے مسلمانوں میں مذہبی بیداری بھی پیدا کر دی ہے۔ اندرونی انحطاط اور بیرونی دباؤ سے سبق لے کر انہوں نے اپنے مذہبی ورثے کے بعض پہلوؤں کی اصلاح و تطہیر کرنے اور بعض کو بحال کرنے کی کوشش کی ہے سب سے زیادہ غیر معمولی بات اسلام کے ساتھ وہ عقیدت ہے جس کا مظاہرہ مسلمانوں نے اس بیسویں صدی میں کیا ہے جبکہ مذہب عام طور سے زوال پذیر ہے۔ اسلام از سرِ نو ایک قوتِ محرکہ بن گیا ہے اور مسلمانوں کے ابھارنے میں کہ وہ دنیا میں اپنے لئے ایک بہتر مقام حاصل کریں اس کا بڑا حصہ ہے"[1]

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۶۸ء) نے استعمار کی غلامی سے مسلمانوں کی آزادی کا سہرا اسلام کے سر باندھا ہے۔

"مسلم ملکوں کے لئے بیسویں صدی کا سب سے ممتاز واقعہ یہ ہے کہ اس صدی میں انہوں نے اپنی آزادی کو برقرار رکھنے یا اسے استعمار سے واپس حاصل کرنے

---

[1] انسائیکلوپیڈیا امریکانہ (۱۹۷۴ء) اسلام کے بارے میں مضمون۔

کی جان توڑ اور کامیاب سے کامیاب تر کوششیں
کی ہیں اور ان کوششوں میں مذہبی جذبات کا بڑا
حصہ ہے"[1]

برٹانیکا پر سپیکٹوز نے صفحہ ۵۱۹ پر مسلمانوں کے مذہبی قوانین
کی موجودہ اہمیت کا ذکر بڑے پُر زور الفاظ میں کیا ہے:-

"ہم دیکھ رہے ہیں کہ پچھلی نصف صدی سے اسلام ایک
بیدار ہونے والے دیو کی مانند کروٹیں لے رہا ہے۔۔۔
جہاں عیسائیت اور اسلام میں اس بات کا مقابلہ
ہو رہا ہے کہ کون زیادہ نو مذہب بناتا ہے۔ مسلمان
ہر ایک نو مذہب عیسائی کے مقابلہ میں دس نو مسلم
بناتے ہیں۔ لوگوں کے طرزِ فکر، طرزِ عمل اور طرزِ قانون
سازی کے تعین کے بارے میں اسلام کی وہ صلاحیتیں
جو دوسرے مذاہب میں بہت کمزور پڑ گئی ہیں۔ اتنی
غیر معمولی ہیں کہ ان کی اہمیت کے بیان میں مبالغہ
کرنا ناممکن ہے"[2]

معاشرتی علوم کی بین الاقوامی انسائیکلو پیڈیا مسلمانوں
کی نئی حیات بخش طاقت کے بارے میں یہ کہتی ہے:-

---

[1] انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا (۱۹۷۴ء) اسلام کے بارے میں مضمون۔

[2] بریٹانیکا پر سپیکٹوز ۱۹۶۸ء جلد ۳ صفحہ ۵۱۹۔

"آج کل مسلمانوں کی کل آبادی پچاس[۰] کروڑ ہے جو دنیا کی کل آبادی کا چھٹا حصہ ہے۔ اس تعداد سے زیادہ اہم حقیقت یہ ہے کہ اسلام تمام دیگر مذاہب سے زیادہ مستعدی کے ساتھ ترقی کر رہا ہے[۱]"۔

"ان اندرونی خطرات (یعنی ذہنی جمود اور وجدانی عناصر کی داخلیت) اور مغربی دہشت انگریزی کا ردِ عمل یہ ہوا ہے کہ اسلام بحالی اور احیاء کی راہ پر گامزن ہو گیا ہے[۲]"۔

میں ان اسناد کو دو وجوہ کی بناء پر زیادہ اہمیت نہیں دیتا پہلی بات تو یہ ہے کہ موجودہ حالات کے اعتبار سے تو یہ بیانات صحیح معلوم ہوتے ہیں لیکن ان کی آئندہ صحت کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ علاوہ ازیں ان مضامین میں مسلم معاشرے کی بعض کمزوریوں کا بھی حوالہ دیا گیا ہے۔ ان کے طویل المیعاد اثرات کو سمجھنے کے لئے سر دست کچھ وسیع النظر تنقیدوں پر غور کیا جائے گا

---

[۱] انٹرنیشنل انسائیکلوپیڈیا آف دی سوشل سائنسیز (۱۹۶۸ء) اسلام کے بارے میں مضمون صفحہ ۲۰۴

نوٹ [۰]:۔ اب ۱۹۸۱ء میں مسلمانوں کی کل آبادی کا اندازہ نوّے کروڑ ہے۔

[۲] انٹرنیشنل انسائیکلوپیڈیا آف دی سوشل سائنسیز۔ اسلام کے بارے میں مضمون۔ صفحہ ۲۱۵

لیکن ایسا کہنے سے پہلے اس بات کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے کہ ان تحریروں میں کہیں ایسے خطرے کا ذکر نہیں کیا گیا ہے جو اسلام کو اشتمالیت سے لاحق ہو۔ اس کی وجہ سمجھنا مشکل نہیں کیونکہ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے یہ نیا نظریۂ حیات مغربی مادیت کی محض ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ اس کی عمر اتنی کم ہے کہ یہ ان مسلمانوں کے لئے خطرناک ہونے کے سوا جو اشتمالی ملکوں میں رہتے ہیں (جن کی تعداد ایک حالیہ رپورٹ کے مطابق ڈیڑھ کروڑ ہے) بذاتِ خود اسلام کے لئے کوئی خطرہ ثابت نہیں ہوا ہے۔ اشتمالیت مذہب کے خلاف روحانی تجربات سے تنفر کا حربہ استعمال کرتی ہے لیکن اشتمالی اگر کوئی ایسا طرزِ زندگی اختیار کرنا چاہتے ہیں جو انہیں پسند ہو تو یہ حقیقت ان پر روشن ہو جائے گی کہ اسلام سے بڑھ کر کوئی طرزِ حیات اس تقاضے کو پورا نہیں کر سکتا۔ اسلام کے ساتھ معاندانہ رویہ کا سبب یہ ہے کہ ان کے رہنما صحیح اسلامی طرزِ زندگی سے واقف نہیں ہیں۔ وہ نظامِ الٰہی پر بلا امتیاز حملے کرتے ہیں خواہ کسی دین سے متعلق ہو۔ لیکن انہیں جلد ہی اپنی غلطی کا احساس ہو جائے گا۔

موجودہ مقصد

اسلام کو سرِ دست سب سے بڑا خطرہ استعمار سے ہے۔ استعمار

نو اور ذہن پلٹنے کی اس پالیسی سے ہے جو مغرب نے کم ترقی یافتہ ملکوں کی ترقی کو ایک معمولی معیار سے بڑھنے نہ دینے کی اختیار کی ہے۔ اس کا سب سے زیادہ نقصان عالم اسلام کو پہنچ رہا ہے غالباً مسلمان سب سے پہلے ان خطرات سے نبٹیں گے۔

(۵)

متوقع اعتراضات

اپنے نظریہ کی تشریح کر دینے کے بعد اب ہم اس بات پر غور کریں گے کہ اس پر کیا کیا اعتراضات کئے جا سکتے ہیں۔ دو قسم کے اعتراضات ذہن میں آتے ہیں ایک کا تعلق اس سارے استدلال کی صحت سے ہو سکتا ہے جو پیش کیا گیا ہے یا اس کی موزونیت سے ہو سکتا ہے۔ دوسری قسم کے اعتراضات اس بیداری کی صحت یا اصلیت پر ہو سکتے ہیں جو مسلمانوں میں آج کل محسوس کی گئی ہے۔ اس نظریہ کی تائید میں جو بحث کی گئی ہے وہ میرے نزدیک مجموعی طور پر صحیح اور درست ہے۔ اس میں کمزوری ہے تو صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کے زوال المیے میں نظم و نسق کا انحطاط، خاندانی جھگڑوں۔ بداعمالیوں اور دیگر معاشرتی برائیوں کا جو حصہ رہا ہے اسے نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اس کمی کی وجہ یہ ہے کہ یہ ساری خرابیاں۔ خامیاں اور کوتاہیاں جاگیردارانہ اور ملوکانہ نظاموں میں مضمر ہیں۔ مشرق و مغرب میں جہاں کہیں ان

نظاموں کا وجود رہا ہے وہاں یہ خرابیاں بھی رہی ہیں۔ مسلمانوں کی بادشاہت اور جاگیرداری کی خصوصیات کو عام بادشاہت اور جاگیرداری کی کمزوریوں سے الگ کر کے پیش کرنے میں بڑی چھان بین کی ضرورت ہے اور پھر بھی لازمی ہے کہ نتیجہ مبہم ہی نکلے گا۔ اس لئے اس بات کو تسلیم کر لینے میں کوئی حرج نہیں کہ وہ بیداری جس کا حوالہ اس بحث میں دیا گیا ہے اگر فریبِ نظر ہے تو پھر وہ نظریہ جو یہاں پیش کیا گیا ہے اسلامی ثقافت میں کہیں کمزوری بھی نہیں آئی غلط فہمی پر مبنی ہو سکتا ہے اور اس کے سلسلے میں جو بحث کی گئی ہے وہ بھی غلط ہو سکتی ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اس بات کو پرکھنے کا طریقہ کیا ہے کہ یہ بیداری فرضی ہے یا حقیقی۔ اس کے دو ہی طریقے ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ اسے موجودہ کیفیت اور رجحانات کے ذریعہ پرکھا جائے اور دوسرا یہ ہے کہ آئندہ واقعات کا انتظار کیا جائے۔ جہاں تک بیداری کے موجودہ رجحانات کا تعلق ہے ہماری نظر میں کچھ مؤرخین ایسے بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ اسلام کی ہمہ گیری پر جدید قومیت غالب آگئی ہے۔ یا آتی جا رہی ہے اور اس غلبہ کی واضح علامت ان کی آپس کی پھوٹ ہے۔ وہ مسلمانوں کی ریاستوں کی کمزور خود مختاری کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے ان میں سے بعض مؤرخین ادریسیہ، سنوسیہ اور وہابی تحریکات کو صرف ایک ایسا وسیلہ سمجھتے ہیں جسے عرب کے سنی مسلمانوں نے

اپنے وابستگان کو جو مظلوم تھے اور اپنی مدافعت کرنا چاہتے تھے۔ عثمانی ترکوں اور برطانوی فرانسیسی اور اطالوی غاصبوں سے لڑائی کے لئے اُبھارنے کے لئے استعمال کیا تھا۔ کچھ مؤرخین ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو اس تبدیلی کو جو تقلید پسند مکتبِ فکر میں اجتہاد کے بارے میں ہوئی ہے۔ حریفانہ جذبہ کا محض ایک ایسا حربہ سمجھتے ہوں جس سے مغرب کی چیرہ دستیوں کا مقابلہ کیا جا سکے۔ ہو سکتا ہے کہ ان خیالات اور قیاسات میں کچھ وزن بھی ہو۔

بہر حال میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ دنیائے اسلام میں مغرب کی تقلید کی خواہش کے باوجود اور فرقہ بندیوں اور عبوری تبدیلیوں کے باوجود اپنے مخالفین پر سبقت لے جانے اور بیسویں یا اکیسویں صدی کے دوران تاریخِ عالم میں اپنے لئے ایک معزز مقام حاصل کرنے کا جذبہ موجود ہے۔ مسلمانوں میں مغربی قسم کی قومیت کا جذبہ ننگا ہوں کے ایک پردے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ عربوں کا آپس میں متحد نہ ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ عرب قومیت کے وہ بیج جو ان میں بوئے گئے تھے پتھریلی زمین میں گرے تھے۔ جزیرہ نمائے عرب کے شمال میں جو عرب ریاستیں ہیں ان کی خود مختاری سے دنیائے اسلام کو مغربی اقوام کی طرف سے ایک تحفہ ملا ہے۔ وہ خود مختار تو ہیں لیکن بڑی طاقتور ریاستوں کا قدم درمیان میں ہے اگر وہ نہ ہوتا اور ان طاقتور ریاستوں نے اپنی پھسلانے اور دھمکانے والی پالیسی سے انہیں

اپنا مطیع اور فرماں بردار نہ بنا لیا ہوتا تو ان میں اور مصر میں اسرائیل کے خلاف اتحاد ہو جاتا۔ اسلام میں جن فرقہ بندیوں کا ذکر غیر مسلموں نے کیا ہے ان میں فرقہ بندیوں نے اسلام کو ایک عالمی طاقت کی حیثیت سے تو کمزور کر دیا ہے لیکن محرک طاقت کی حیثیت سے کمزور نہیں کیا۔

یہ تو تھا واقعات کا جائزہ۔ اگر ہم مزید واقعات کا انتظار کرتے رہیں تو ہمیں نتیجہ تو ایک دن معلوم ہو جائے گا۔ لیکن وہ کوئی ایسا نتیجہ نہ ہو گا جو کسی تجربہ گاہ میں مسلمانوں کی بیداری پر کی ہوئی تحقیق سے برآمد ہوا ہو بلکہ متعدد طاقتوں اور مفادات کے ٹکراؤ کا نتیجہ ہو گا۔ آج کل بڑی طاقتوں کا شیوہ ہے کہ کم ترقی یافتہ طاقتوں کو ابھرنے نہ دیں تاریخ میں کوئی ایسی مثال نہیں ملتی کہ بڑی طاقتوں نے کبھی ایسی سوچی سمجھی پالیسی اختیار کی ہو جس کا مقصد پسماندہ اقوام کو ہمیشہ کے لئے پسماندہ رکھنا ہو لیکن آج کل یہی کیفیت ہے۔ زمانہ گذشتہ میں بھی مختلف اقوام آپس میں لڑتی تھیں۔ ایک دوسرے کو لوٹتیں۔ سزا دیتیں اور تباہ کرتی تھیں لیکن کمزور ریاستوں کو دانستہ نیم جان رکھنے کی کوشش نہیں کرتی تھیں جیسا کہ آج کل اس متمدن دور میں ہو رہا ہے۔ انتہا یہ ہے کہ علم تک کے حصول پر پابندی عائد کر دی گئی ہے مثال کے طور پر جوہری توانائی اور ترقی یافتہ فنیات کے علم کے صیغہ راز میں رکھنے کی پالیسی کے حق میں دلائل پیش کئے جاتے ہیں۔

اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ یہ راز داری بنی نوع انسان کے مفاد میں برتی جا رہی ہے۔ مادی امداد اور قرضے اس امر کا اطمینان کر لینے کے بعد دیئے جاتے ہیں کہ وہ صرف تباہ حالی سے نجات پانے کے لئے استعمال کئے جائیں گے لیکن ان سے محتاجی ختم نہیں ہو گی بلکہ برقرار رہے گی۔ موجودہ دور سے پہلے دنیا غلامی کی لعنت سے ناواقف نہیں تھی لیکن اس غلامی پر کوئی پردہ نہیں پڑا ہوا تھا۔ اس کے برعکس جدید غلامی ایک ایسا زہر ہے جو آہستہ آہستہ سرایت کرتا ہے۔ یہ ایک دائمی لعنت ہے۔

پچھلے دو سو سال میں دنیائے اسلام کا ذہن پلٹنے کی بڑی کوشش کی گئی ہے۔ اس ذلیل کام میں عیسائی مشن اسکولوں اور کالجوں، مغربی یونیورسٹیوں، مؤرخین اور مستشرقین نے بڑی احتیاط سے اپنا کردار ادا کیا ہے۔ وہ مسلمان جوان کی عظمت سے مرعوب نہیں ہوئے جانتے تھے کہ ان خدمات میں جو انہیں پیش کی جا رہی تھیں کس قدر بدنیتی تھی۔ ایک ممتاز جدید مؤرخ اینڈریو سی ہیس (ANDREW C. HESS) نے اس امر کی شہادت پیش کی ہے کہ یہ دلچسپ کھیل کس طرح کھیلا جا رہا تھا۔ اس نے اپنے مضمون "اتفاق یا اختلاف مسلمانوں کی تاریخ نگاروں کا مخمصہ" میں یہ لکھا ہے:

"مشرق وسطیٰ کی زبانوں اور ثقافتوں پر مغرب کے مستشرقین نے اتنی محنت اور اتنا وقت اس لئے صرف

کیا ہے کہ اسلامی تاریخ سے واقفیت حاصل کی جائے
کیونکہ یہ تاریخ بنی نوعِ انسان کے تجربات کا بہت
بڑا حصہ تھی۔ لیکن کچھ عوامل اور بھی تھے جن کے پیشِ نظر
علمائے مغرب نے اسلامی تاریخ کا مطالعہ کیا۔ ایک
غرض یہ تھی کہ غیر ثقافت کے مطالعہ سے خود اپنی
روایات کی صحت کی توثیق کی جائے۔ اسلامی طور طریقوں
سے واقفیت اس لئے بھی ضروری تھی کہ مختلف قسم
کی شہنشاہی جو حاصل ہوگئی تھی اس کی خدمت
کے لئے مسلمانوں کو مغربی رسم و رواج کی برتری کا
قائل کر سکیں[1]

وہ یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ مسلمانوں کی تاریخ کا مطالعہ مغرب میں اس واسطے شروع کیا گیا کہ اس تاریخ کا جو اثر عیسائیت پر ہوا اس کے مکمل اسباب معلوم کئے جائیں۔ اسلام کے غلبہ کا توڑ کرنے کیلئے پیٹر مقدس نے پہلی بار قرآن مجید کا انگریزی میں ترجمہ شروع کیا تھا۔ جسے اس کے شرکائے کار نے ۱۱۴۱ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ پھر پادریوں نے افریقہ کے لوگوں کو اپنا مذہب تبدیل کرنے کی دعوت دینے کے لئے اسلام کا مطالعہ کیا لیکن وہ نہ تو اسلام ہی کا مطالعہ کرنے

---

[1] اینڈریو سی ہیس۔ کنیسنز آرکمنفلکٹ۔ دی ڈیلما آف اسلامک ہسٹوریز (اتفاق یا اختلاف: مسلم مؤرخین کا مخمصہ۔ امریکن ہسٹاریکل ریویو۔ اکتوبر ۱۹۷۶ء

میں کامیاب ہوئے اور نہ لوگوں کو اپنا مذہب تبدیل کرانے کے لئے آمادہ کرنے میں۔ بعدازاں ان دیگر مقاصد کو حاصل کرنے کی کوششیں کی گئیں جن کا حوالہ پروفیسر اے۔ سی۔ ہیں نے دیا ہے۔

اس کا خیال ہے کہ مغربی مؤرخین اور مستشرقین نے بجائے مندرجۂ بالا مقاصد کو حاصل کرنے کے دنیائے اسلام کی نادانستہ مدد کی ہے اور یہ سلسلہ اب ختم ہونا چاہیئے اس کے نزدیک مسلمان اپنی تاریخ کو ایک ایسے معاشرے کی کہانی سمجھتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ کی رہنمائی حاصل ہے اور مغربی اہلِ قلم ان کے اس جال میں پھنس گئے ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کے پرانے طور طریقوں کو صحیح قرار دے کر اور ان کے آپس کے تنازعات سے بڑی حد تک صرفِ نظر کر کے ان کے اتحاد کی نادانستہ حمایت کی ہے۔ انہوں نے روایتی اسلامی تاریخ پر مہر لگا دی ہے اور "اسلامی تہذیب کی شان و شوکت میں اضافہ کر دیا ہے" اس لئے اس نے ایسے طریقے بتائے ہیں جن سے مسلمانوں کی تاریخ کے "نفسیاتی حصار" کو توڑا جا سکے۔ اور ایچ۔ اے۔ آر گبز (H. A. R. GIBBS) اور گسٹیو وان گرن بام (GUSTAV VON GRUNBAUM) پر لعن طعن کی ہے کہ ان کو اس امر کی کیا ضرورت تھی کہ۔

"علمائے دین سے تبادلۂ خیال کیا جائے اور انہیں مشورہ دیا جائے کہ وہ جدید مسائل سے کس طرح عہدہ

برآ ہوں"۔

اس کا مقصد یہ ہے کہ مستشرقین اور مغرب کے مؤرخین مسلمانوں کے قدیم طور طریقوں کی مذمت کریں اور جو جو اختلافات نظر آئیں ان کو نمایاں کریں۔ مسلمانوں کو اس طرف متوجہ نہ ہونے دیں کہ جدید مسائل کو حل کیا جائے۔ وہ اپنے سب معاصرین کو متنبہ کرتا ہے کہ مستشرقین کے مذکورہ طرزِ عمل سے مغربی مفادات کو نقصان پہنچا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

"مسلمانوں کے ماضی کو خود ان کے علماء کی متفقہ فراست کی روشنی میں تلاش کرنے پر مغرب کا مزید وقت اور روپیہ صرف کرنا تقلیل حاصل کا موجب ہوگا"۔

وہ یہ نہیں چاہتا کہ اسلامی تاریخ پر مغرب اپنی توانائی ضائع کرے چنانچہ اس نے مندرجۂ ذیل الفاظ میں واضح طور پر تنبیہہ کی ہے:۔

"اسلامی تہذیب جس ثقافتی اتحاد کی داعی ہے وہ اتحاد مشرقِ وسطیٰ کو ایسے رشتوں میں منسلک کرتا رہے گا جسے نظر انداز کرنا مسلمانوں کی تاریخ کے (مغربی) مؤرخین کے لئے خطرہ سے خالی نہیں ہے"۔

وہ اپنے بنائے ہوئے طریقِ کار کا خلاصہ بالآخر اس طرح بیان کرتا ہے۔

"تاریخ و ثقافت اسلامی کے مغربی مصنفین اپنے محدود ادبی نقطۂ نظر کو بدل سکتے ہیں انہیں چاہیئے کہ وہ مسلمانوں کی انتہا پسندانہ تحریکوں کا سراغ لگائیں۔ ان کے کلاسیکی دور کے اتحاد پر زیادہ اعتراض کریں اور اسلامی معاشرے کی پسماندہ معاشرتی اور اقتصادی تاریخ کو کم سے کم اس طرح پیش کریں کہ وہ آویزشوں سے خالی نظر نہ آئے۔"

مختصر یہ کہ وہ مغربی مؤرخین اور مستشرقین کو یہ مشورہ دیتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے اتحاد اور اسلام کی ہمہ گیری کو نہ اچھالیں بلکہ مسلمانوں کے اندرونی اور بیرونی تنازعات کو نمایاں کر کے ان کی تاریخ کو "جدید" یعنی "لادینی" بنا دیں۔ وہ مستشرقین کی ان خدمات کو کافی نہیں سمجھتا کہ انہوں نے مسلمانوں کو مغربی رسم و رواج کی برتری اور خود اپنی تہذیب کی کمتری کا قائل کیا ہے۔ ان مؤرخین اور مستشرقین نے دنیا پر ان تمام کمزوریوں کا انکشاف کر کے جو انہیں مسلمانوں کی سیاسی، ثقافتی اور مذہبی تاریخ میں نظر آئیں یا جن کا وہ تصور کر سکے دل کی بھڑاس نکالی ہے۔ یہ کام انہوں نے کبھی دشمن بن کر کبھی دوست بن کر اور کبھی مربی بن کر انجام دیا ہے۔ اگر پروفیسر اندریوسی۔ ہیس کا مشورہ قبول کر لیا گیا تو دانستہ افترا پردازی کے ایک نئے دور کا آغاز ہو جائے گا۔ اسے احساس نہیں ہے کہ غیر جانب دار

مؤرخین اس کے طرزِ عمل کو ایک دن مغربی شان و شوکت کے فنا ہونے کا سبب قرار دیں گے۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کی تخلیقی صلاحیتیں سات سو سال سے زنگ خوردہ ہو رہی ہیں۔ ان کا وجود ڈھائی سو سال سے بیرونی سیاسی سازشوں کا شکار رہے۔ ان کے دل و دماغ کی کیفیات مستعمر طاقتیں اور عیسائی مشن عرصہ دراز سے بدل ڈالنے کی مسلسل کوششیں کر رہے ہیں۔ اہل مغرب اس متمدن دور میں تازہ ترین علم کے انسانی حق سے عالم اسلام کو محروم کر رہے ہیں۔ مسلمان اپنے کو مستحکم کرنے کے لئے جو امداد اور قرضے مغرب سے طلب کرتے ہیں۔ اور سامان کی خریداری کے لئے جو معاملات کرتے ہیں۔ ان سے ایسی شرائط وابستہ کر دی جاتی ہیں کہ وہ اپنی کمزوریوں سے کبھی نجات نہ پا سکیں۔ ان حالات میں بیداری کی ایک ہلکی سی لہر کے پیدا ہونے کو بھی اُن کی دلیرانہ امنگوں کی علامت سمجھنا چاہیئے۔ وہ جس حد تک بھی بیدار ہوئے ہیں وہ اسلام کی قوتِ محرکہ ہی کا ایک معجزہ ہے۔

مطبوعاتِ

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس

نظامتِ تعلیمات (ڈائرکٹر آف ایجوکیشن) کراچی سے منظور شدہ کتابیں*

گلشنِ بے خار ــــ مصنفہ نواب مصطفٰے خاں شیفتہ
ــــ ۲۴ روپے ــــ

* ۲ رومن رسم الخط اور پاکستان ــ مصنفہ مولانا سید عبدالقدوس ہاشمی ندوی ــ ایک روپیہ ــ

* ۳ قدیم شہنشاہیاں ــ مصنفہ مولانا سید طفیل احمد منگلوری (علیگ) ــ ۶ روپے ــ

۴ نقدِ ادب ــ مترجمہ ل۔ احمد اکبر آبادی
ــ ۶ روپے ــ

ر ا تا ر ۲۷

۵ سرسید کا علمی کارنامہ ——— مصنفہ قاضی احمد میاں اختر

——— جوناگڑھی ——— ۳ روپے۔

۶ اُردو زبان اور اسالیب ——— مصنفہ سید محمد محمود رضوی

——— مخمور اکبرآبادی ——— ۱۸ روپے۔

۷ مشرقی اور مغربی تہذیب ——— مصنفہ ڈاکٹر احسان محمد خاں

——— ایم۔اے پی ایچ ڈی (لیڈز) ——— ۶ روپے۔

۸ راہی اور راہ نما ——— مصنفہ سید الطاف علی بریلوی

——— بی۔اے (علیگ) ——— ۱۲ روپے۔

* ۹ ثقافت و انتشار ——— مترجمہ اخلاص حسین زبیری

——— ایم۔اے و انعام عظیم برنی۔ایم۔اے ——— ۱۲ روپے۔

* ۱۰ طالب علم کی ڈائری ——— مصنفہ سید الطاف علی بریلوی

——— بی۔اے (علیگ) ——— ۶ روپے

۱۱ مسلم خواتین کی تعلیم ——— مصنفہ محمد امین زبیری

——— ۴ روپے۔

۱۲ نواب خان بہادر خاں شہید ——— مؤلفہ سید مصطفےٰ علی

——— بریلوی بی کام ایل، ایل، بی ——— ۸ روپے

۱۳ عہدِ بنگش کی علمی، سیاسی اور ثقافتی تاریخ

——— مصنفہ مفتی ولی اللہ فرخ آبادی ———

——— مترجمہ حکیم شریف الزماں شریف اکبرآبادی ——— ۲۴ روپے

۳۸ تعلیم و تعلم ــــ مرتبہ سید الطاف علی بریلوی (علیگ) ــــــ
ــــــ مقدمہ ۔ سید عبدالقدوس ہاشمی ندوی ــــ ۱۴ روپے ۔

۳۹ تعلیم بالغان اور اس کی قومی اہمیت ــــــــــ
ــــ تصنیف ۔ مولوی مظہر الرحمٰن بچھرایونی ۔ مقدمہ ۔ پروفیسر ڈاکٹر
ــــ محمود حسین پی ایچ ڈی ــــــــ ۶ روپے ــــ

۴۰ تعلیم کے ابتدائی اُصول ــــ حصہ اوّل ــــــــ
ــــ تصنیف ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایم، اے ۔ پی ایچ ڈی ڈی لٹ
ــــ مترجمہ مولوی سبطین احمد بدایونی ــــ دس روپے

۴۱ تعلیم کے ابتدائی اُصول حصہ دوم ــــــــ
ــــ تصنیف ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایم اے ۔ پی ایچ، ڈی ۔ ڈی لٹ ۔
ــــ مترجمہ ۔ مولوی سبطین احمد بدایونی ــــ دس روپے ۔

۴۲ پاک و ہند میں تعلیمی ترقی ــــ مترجمہ ۔ سید احسن مارہروی ایم ۔ اے
ــــ (علیگ) ــــــــ ۵ روپے ــــ

* ۴۳ اقبال کے تعلیمی نظریات ــــ تصنیف محمد احمد صدیقی ــــ
ــــ بی ۔ اے (آنرز) ایم ۔ اے، بی ٹی (علیگ) تعارف و مقدمہ ــــ
ــــ سید الطاف علی بریلوی و اخلاص حسین زبیری ایم اے ــــ ۱۶ روپے ۔

۴۴ ہسٹری آف مسلم ایجوکیشن ــــ (بزبان انگریزی) جلد اوّل ۱۲ء تا
ــ ۵۰۰ء ۔ تصنیف پروفیسر محمد حامی الدین خان ایم ۔ اے ــــ ۲۴ روپے

۴۵ رفقائے عظیم (گریٹ پینینس) تصنیف میکس ایسٹ مین ــــ
ــ مترجمہ پروفیسر محمد حامی الدین خاں ایم ۔ اے علیگ ــــ ۲۰ روپے

۴۶ حیاتِ مابعد ــــ تصنیف سید ضامن حسین نقوی گویا جہاں آبادی
ــــ مقدمہ ڈاکٹر ایم احمد چیرمین شعبۂ فلاسفی کراچی یونیورسٹی
ــــــــ ۷ روپے ــــــــ

۴۷ تجددِ امثال ــــ تصنیف سید ضامن حسین نقوی گویا جہاں آبادی
ــــ مقدمہ ڈاکٹر ایم۔ ایم احمد ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی ــــ ۴ روپے
۴۸ مقدرِ انسانی (ہیومن ڈسٹنی) تصنیف لی کامت دو نوائے ــــ
ــــ مترجمہ پروفیسر عبد المجید قریشی (علیگ) ــــ ۱۶ روپے
۴۹ یادیں اور خاکے ــــ تصنیف سیدہ انیس فاطمہ (بریلوی) ــــ
ــــ مقدمہ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی ایم اے پی ایچ ڈی ــــ ۶ روپے
۵۰ تاثرات و مشاہدات ــــ تصنیف سیدہ انیس فاطمہ بریلوی ــــ
ــــ مقدمہ پروفیسر ڈاکٹر شوکت سبزواری ایم اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ۶ روپے
۵۱ پاکستان کا معاشی پس منظر ــــ تصنیف۔ سیدہ انیس فاطمہ بریلوی
ــــ پیش لفظ ڈاکٹر سید ظہیر الدین ایم۔ اے۔ ڈی۔ لٹ ــــ ۷ روپے
۵۲ مولانا محمد علی جوہر حیات اور تعلیمی نظریات ــــ
ــــ مصنفہ ثناء الحق صدیقی ایم۔ اے ــــ ۸ روپے۔
۵۳ مسلمانانِ پنجاب کی تعلیم ــــ مصنفہ سید مصطفےٰ علی بریلوی ــــ
ــــ بی کام ایل ایل بی ــــ ۲۰ روپے ــــ
۵۴ تجزیۂ کلامِ غالب ــــ مصنفہ سید رفیع الدین بلخی ایڈوکیٹ ــ ۱۲ روپے
۵۵ ادب منزل بہ منزل ــــ مصنفہ سیدہ انیس فاطمہ بریلوی ــــ
ــــ مقدمہ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی ایم۔ اے پی ایچ ڈی ــــ ۱۲ روپے۔
۵۶ مکاشفاتِ کشفی ــــ مصنفہ میجر خان بہادر مرزا ابو جعفر کشفی ــــ
ــــ پیش لفظ خان بہادر رضا علی وحشت ــــ تعارف و تبصرہ ــــ
ــــ سید الطاف علی بریلوی و پروفیسر جمیل مظہری ایم اے ــــ ۶ روپے
۵۷ وادیٔ نیل ــــ تصنیف محمد قطب الدین ایم ایس سی عثمانیہ ــــ
ــــ مقدمہ پروفیسر شمیم اختر (کراچی یونیورسٹی) ــــ
ــــ ۲۴ روپے ــــ

۵۸ مسلمانانِ بنگال کی تعلیم ــــ از سید مصطفٰے اعلی بریلوی ــــ
ــــ بی کام ایل ایل بی ــــ ۲۰ روپے ــــ

۵۹ تاریخی شہ پارے ــــ از مرزا علی اظہر برلاس بی اے ایل ایل بی
ــــ ۲۰ روپے ــــ

۶۰ فرحت الناظرین ــــ مصنفۂ محمد اسلم خلف محمد حافظ پسروری
ــــ مترجمۂ پروفیسر محمد ایوب قادری ایم اے ــــ ۱۴ روپے -

۶۱ مقالاتِ بریلوی ــــ از سید الطاف علی بریلوی بی۔اے (علیگ)
ــــ ۲۰ روپے ــــ

۶۲ چند محسن چند دوست ــــ تصنیف سید الطاف علی بریلوی
ــــ بی۔اے (علیگ) مقدمہ ڈاکٹر ممتاز حسن ایم اے ایل ایل ڈی
ــــ (ستارۂ پاکستان) ــــ ۱۰ روپے ــــ

۶۳ حکیم عمر خیام ــــ تالیف ابوالمکارم سلیم اللہ فہمی ــــ
ــــ مقدمہ۔ سید الطاف علی بریلوی ــــ ۵ روپے ــــ

۶۴ صوفیائے بہار اور اردو ــــ تصنیف پروفیسر محمد معین الدین
ــــ دردائی ایم۔اے (علیگ) ــــ ۸ روپے ــــ

۶۵ صوفیائے سندھ اور اردو ــــ تصنیف پروفیسر محمد معین الدین
ــــ دردائی ایم۔اے (علیگ) ــــ ۱۴ روپے ــــ

۶۶ مسئلۂ علم مسلم مفکرین کی نظر میں ــــ از پروفیسر محمد یعقوب بخش
ــــ راغب بدایونی ــــ ۴ روپے ــــ

۶۷ ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے عہد میں ــــ (بزبان انگریزی)
ــــ مترجمۂ ڈاکٹر زبید احمد ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی ــــ ۱۴ روپے

۶۸ ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے عہد میں۔ (بنگالی ترجمہ)
—از مولانا غلام محی الدین ایڈیٹر "آج" ڈھاکہ——۳ روپے

۶۹ مشاہیر کے تعلیمی نظریئے——(انگریزی ترجمہ)——
——تالیف مولوی محمد حسین خاں زبیری ایم۔اے——
—مترجمہ عظیم الدین خاں ایم۔اے (علیگ) اخلاص حسین زبیری
—ایم۔اے۔ پیش لفظ سید الطاف علی بریلوی بی اے (علیگ) ۱۶ روپے

۷۰ حاصلِ مطالعہ——تصنیف سیّد الطاف علی بریلوی——
——مقدمہ۔ پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان ایم۔اے پی ایچ
——ڈی، ڈی لٹ——————۱۶ روپے——

۷۱ انشائیے——تصنیف فضل احمد صدیقی ایم۔اے——
——مقدمہ۔ پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفےٰ ایم اے پی ایچ ڈی—
—تعارف سید الطاف علی بریلوی بی اے علیگ——۱۰ روپے—

۷۲ غالب نمبر (العلم)——مرتبہ سیّد الطاف علی بریلوی—
——————۲۰ روپے——————

۷۳ علمائے سلف ونابینا علماء—تصنیف۔ نواب صدر یار جنگ
——مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی تعلیقات وحواشی—
——مفتی انتظام اللہ شہابی وثناء الحق ایم اے——
——تعارف۔ علامہ سید سلیمان ندوی——۱۸ روپے——

۷۴ حیاتِ حافظ رحمت خاں—تالیف سید الطاف علی بریلوی
—بی۔اے (علیگ) مقدمہ مولوی نظام الدین حسین نظامی (بدایونی)
——————۲۴ روپے——————

۷۵ لائف آف حافظ رحمت خاں ــــ (انگریزی ترجمہ) ــــ
ــــ تالیف سید الطاف علی بریلوی مترجمہ پروفیسر محمد حامی الدین خاں
ــــ ایم۔ اے ــــ ۳۰ روپے ــــ

۷۶ علم و عمل وقائع عبد القادر خانی ــــ (جلد اوّل) ــــ
ــــ مؤلفہ مولوی عبد القادر برلاس، ترجمہ مولوی معین الدین افضل گڑھی
ترتیب و حواشی پروفیسر محمد ایوب قادری، تعارف نواب صدر یار جنگ بہادر
مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی ــــ ۱۶ روپے ــــ

۷۷ علم و عمل وقائع عبد القادر خانی ــــ (جلد دوم) ــــ
ــــ مؤلفہ مولوی عبد القادر برلاس، ترجمہ مولوی معین الدین افضل گڑھی
ترتیب و حواشی پروفیسر محمد ایوب قادری، تعارف نواب صدر یار جنگ بہادر
مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی ــــ ۱۶ روپے ــــ

۷۸ شیخ عبد القدوس گنگوہیؒ اور ان کی تعلیمات ــــ
ــ تعارف سید الطاف علی بریلوی مؤلف مولانا اعجاز الحق قدوسی
ــ تعارف ڈاکٹر اینی میری شمیل پروفیسر بون یونیورسٹی (مغربی جرمنی)
پیش لفظ جمیل جالبی ایم اے ناشر سید الطاف علی بریلوی ــــ ۲۰ روپے

۷۹ تعلیماتِ حضرت شاہ میناؒ ــــ (تلخیص و ترجمہ فوائد سعدیہؒ)
ــ مؤلفہ الحاج محمد خصلت حسین صابری ایم۔ اے (علیگ)
ــ مقدمہ ــ مفتی محمد انتظام اللہ شہابی اکبر آبادی ــــ ۶ روپے ــ

۸۰ عہدِ اسلامی میں علمی ترقی ــــ مصنف ڈاکٹر این لام ــــ
ــــ مترجمہ اخلاص حسین زبیری ایم۔ اے و سلطان فاطمہ بلخی ایم اے
ــــ ۱۶ روپے ــــ

۸۱ ہسٹری آف مسلم ایجوکیشن ـــــ بزبان انگریزی ـــــ
ـــــ جلد دوم ۱۷۵۱ء تا ۱۸۵۴ء حصہ دوم ـــــ
ـــــ از پروفیسر محمد حامی الدین خاں ایم۔ اے ـــــ ۲۴ روپے ـــــ

۸۲ چوتھی دُنیا ـــــ مصنفہ سیدہ انیس فاطمہ بریلوی ـــــ
ـــــ ۸ روپے ـــــ

۸۳ شیخ الاساتذہ ـــــ از اشتیاق حسین اظہر ـــــ
ـــــ مولانا غلام یحییٰ ہزاروی ـــــ ۸ روپے ـــــ

۸۴ نظامِ مصطفیٰ کیا ہے؟ اور کس طرح قائم کیا جا سکتا ہے؟
از جسٹس قدیر الدین احمد ـــــ ۲ روپے ـــــ

۸۵ معارفِ اقبال ـــــ از ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں ایم، اے ایل ایل
بی، پی ایچ ڈی۔ ڈی لٹ ـــــ ۸ روپے ـــــ

۸۶ ۱۹۴۷ء کے آنسو ـــــ از سید مصطفیٰ علی بریلوی بی کام،
ـــــ ایل ایل بی ـــــ ۸ روپے ـــــ

۸۷ بلوچستان میں تعلیم ـــــ از پروفیسر انور رومان ـــــ
ـــــ ۲۰ روپے ـــــ

۸۸ تاریخِ شاہ عالم ـــــ (ہسٹری آف شاہ عالم) از ڈبلیو فرنیکلن
ـــــ مترجمہ ثناء الحق صدیقی ایم اے ـــــ ۲۴ روپے ـــــ

۸۹ تاریخ التعلیم ـــــ (ہسٹری آف ایجوکیشن) از میجر بی ڈی باسو
ـــــ مترجمہ وارث سرہندی ایم اے ـــــ ۲۰ روپے ـــــ

۹۰ راہ و منزل ـــــ از جسٹس قدیر الدین احمد ـــــ
ـــــ ۲۰ روپے ـــــ

۹۱ پروفیسر رشید احمد صدیقی اپنے مضامین کے آئینہ میں
——— از پروفیسر معین الدین دردائی ایم اے (علیگ)
——— ۲۴ روپے ———

۹۲ اسلام اور تہذیبی ارتقاء ———
——— از مولانا عبید اللہ قدسی ———
——— ۶ روپے ———

۹۳ مسلمانانِ صوبۂ سرحد کی تعلیم ———
——— از سید مصطفےٰ علی بریلوی بی کام، ایل ایل بی ———
——— ۲۵ روپے ———

۹۴ مسلمانانِ کراچی و سندھ کی تعلیم ـ تالیف سید مصطفےٰ علی بریلوی بی کام ایل ایل بی۔ مقدمہ مرزا علی اظہر برلاس بی اے بی ایل ـ ۱۰ روپے

ملنے کا پتہ

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس ۱/۴۵ ـ J ـ I ناظم آباد بی عدد ڈاکخانہ

٭ نشان زدہ کتب فی الحال اسٹاک میں موجود نہیں ہیں۔

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی
لائبریری، ریڈنگ روم اور میوزیم

جس طرح علی گڈھ میں سرسید علیہ الرحمتہ کی ۱۸۸۶ میں بنا کردہ ''آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس'' کا ایک شاندار کتب خانہ تھا اسی طرح اپریل ۱۹۵۱ء میں جب اس ادارہ کا کراچی میں ''آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس'' کے نام سے احیا ہوا تو اجرائے سہ ماہی مجلہ ''العلم'' انعقاد مجالس و مذاکرات علمی و تعلیمی - قیام سرسید گرلس کالج اور شعبۂ تصنیف و تالیف کے ماسوا اس کے صدر دفتر بمقام سندھ مدرسہ (اپریل ۱۹۵۱ء تا مئی ۱۹۵۶) سعیدہ منزل رضویہ کالونی (جون ۱۹۵۶ء تا دسمبر ۱۹۷۱ء) اور اب ذاتی عمارت واقع بی۔ روڈ۔ ناظم آباد کراچی، میں جنوری ۱۹۷۲ء سے ''یوسف میموریل لائبریری'' کے نام سے ایک فری پبلک لائبریری قائم ہے جس میں سال بسال جملہ علوم و فنون پر کثیر تعداد میں کتابوں کا اضافہ ہوا ہے اور ان کی تعداد دس ہزار سے متجاوز ہوگئی ہے۔ بڑی تعداد میں انگریزی، اردو اور دیگر زبانوں کے ملکی و غیر ملکی اخبارات و رسائل بھی مہیا کئے جاتے ہیں۔ ہر موسم میں آرام دہ خوبصورت ہال اور فرنیچر اس پر متزاد ہے۔ جس کے نتیجہ میں لائبریری کی مقبولیت روزافزوں ہے۔ دور دور سے طالبان علم اور علمائے تحقیق جوق در جوق مطالعہ کے لئے آتے ہیں۔

اوقات دفتر کانفرنس کے بعد ۱/۲ ۳ بجے شام سے ۹ بجے شب تک لائبریری ریڈنگ روم اور میوزیم کھلا رہتا ہے، جن خواتین و حضرات کو اب تک علم نہ ہو تشریف لا کر استفادہ فرمائیں۔

ع صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے

سید الطاف علی بریلوی
سکریٹری